نسائیت کی بے باک ترجمان امرتا پریتم: ایک مطالعہ

(تحقیقی مقالہ برائے بی ایس اردو)

مقالہ نگار

سیدہ لبنیٰ بینش امین

نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر محمد ساجد خان

شعبہ اردو جامعہ کراچی

۲۰۲۵

انتساب

ان تمام خواتین کے نام جو پدر سری سماج میں اپنی شناخت کھو بیٹھی ہیں۔

مقدمہ

میرا تحقیقی مقالہ بعنوان "نسائیت کی بے باک ترجمان امرتا پریتم" امرتا پریتم کی تحریروں میں نسائی شعور کے مطالعے پر مبنی ہے۔اس تحقیق کی بنیاد امرتا پریتم کی زندگی اور ان کے ادبی کردار کے بارے میں ناقدین کی آراء اور تنقیدی مطالعہ پر رکھی گئی ہے۔امرتا پریتم پنجابی ادب کی مایہ ناز ادیبہ اور شاعرہ تھیں، اور ان کی زندگی و ادبی خدمات پر مختلف ناقدین نے متنوع آراء پیش کی ہیں۔ان آراء کی روشنی میں میری تحقیق یہ جاننے کی کوشش کرے گی کہ امرتا پریتم نے پدر سری سماج میں میں کس طرح اپنی شناخت بنائی اور اس ضمن میں ان کے نسائی شعور اور تخلیقات نے کس حد تک معاونت کی۔

امرتا پریتم کی زندگی اور ادبی خدمات پر ناقدین کے تجزیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے سماجی پابندیوں اور مردانہ تسلط کے باوجود اپنے ادبی اور فکری موقف کو برقرار رکھا۔انہوں نے نہ صرف اپنی تحریروں میں عورت کے جذبات، احساسات اور حقوق کی نمائندگی کی بلکہ ایک مزاحمتی آواز کے طور پر بھی اپنی پہچان قائم کی۔موجودہ دور میں پدر سری نظام میں ذہنی و فکری طور پر محبوس خواتین کی شعوری بیداری اور خود آگاہی کے لیے یہ تحقیق ایک اہم ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

تحقیق میں بنیادی طور پر یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ امرتا پریتم کی ذاتی زندگی اور ان کے ذاتی تجربات نے ان کے فکری رویّے اور نسائی شعور کی تشکیل میں کس حد تک کردار ادا کیا۔اس ضمن میں یہ سوال بھی اہم ہے کہ ان کی تخلیقات میں عورت کی شناخت کس طرح پدر سری نظام کے خلاف مزاحمت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے اور وہ کن فکری و سماجی حوالوں سے اس نظام کو چیلنج

کرتی ہیں۔ مزید برآں، یہ تحقیق امرتا پریتم کے افسانوں، ناولوں اور نظموں میں عورت کے جذباتی اور نفسیاتی مسائل کے اظہار کا جائزہ لیتی ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے کہ یہ مسائل کس فنی اور علامتی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

اس مقالے میں یہ سوال بھی زیرِ بحث ہے کہ امرتا پریتم کا نسائی شعور برصغیر کے سماجی، ثقافتی اور تاریخی تناظر میں کس نوعیت کی فکری بغاوت کی نمائندگی کرتا ہے اور ان کی تحریریں روایتی نسوانی کردار کے تصور سے کس حد تک مختلف ہیں۔ مزید یہ کہ تحقیق کا مقصد یہ جانچنا بھی ہے کہ امرتا پریتم کے تخلیقی ادب میں پیش کی گئی عورت کس طرح ایک باخبر، خودمختار اور سوال اٹھانے والی ہستی کے طور پر سامنے آتی ہے، جو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کا شعور رکھتی ہے۔ آخر میں یہ سوال بھی تحقیق کا حصہ ہے کہ آیا امرتا پریتم کی تحریریں موجودہ دور کی خواتین میں خود آگاہی، خود اعتمادی اور فکری بیداری پیدا کرنے میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں یا نہیں۔

چونکہ امرتا پریتم بنیادی طور پر پنجابی زبان کی شاعرہ اور ادیبہ ہیں، اس لیے یہ سوال بھی تحقیق کا اہم حصہ ہے کہ اردو زبان و ادب میں موجود ان کے تراجم کس حد تک اردو ادب کے قارئین کے لیے سودمند ثابت ہوئے ہیں

فہرست

نسائیت کی بے باک ترجمان امرتا پریتم: ایک مطالعہ



امرتا پریتم

باب اول

نسائیت کی تعریف، آغاز، جدوجہد

نسائیت، تانیثیت فیمنزم کی متعدد تعریفیں متعین کی جاسکتی ہیں اور کی جاچکی ہیں مثال کے طور پر انسائیکلو پیڈیا پر بریٹینکا کے مطابق۔

"فیمنزم ایک سماجی تحریک ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کے لیے جدوجہد کرتی ہے"(۱)

ایک لغت میں فیمنزم کی تعریف اس طرح درج ہے

"فیمنزم سیاسی معاشی، اور سماجی حوالے سے جنس صنفی مساوات کا نظریہ ہے "(۲)

ایک اور تعریف اس طرح ہے کہ

"فیمنزم ایک نظریاتی وابستگی بھی ہے اور ایک سیاسی تحریک بھی جو عورتوں کے لیے انصاف کے حصول اور معاشرے سے جنس صنفی امتیازات کے خاتمے کے لیے کوشاں ہے"۔(۳)

یا یہ کہ

"فیمنزم عورتوں کے حقوق اور مفادات کے کام کرنے والی تحریک ہے" (٤)

Nancy Cott کے خیال میں جنسی منفی مساوات پر یقین رکھنے اور عدم مساوات کے تصور پر قائم موجودہ نظام کے رد کر دینے کا نام فیمنزم ہے۔(۵)

اس طرح ایک نقاد کا خیال ہے کہ

"نسائیت یا فیمنزم دراصل کوئی ایک تحریک یا نظریہ نہیں بلکہ کئی تحریکات اور نظریات کا مجموعہ ہے"(٦)

"Feminism is a discourse that involves various movements, theories and philosophies which are concerned with issues of gender difference, advocate equality for women and compaign for women rights and interests"(٧)

مندرجہ بالا تمام عبارتوں سے یہ ایک بات صاف واضح ہوتی ہے کہ فیمنزم ایک فلسفہ حیات اور انداز فکر کا نام بھی ہے اور ایک ملی تحریک بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے پیچھے نہ کوئی تنہا نظریہ یا فلسفہ موجود ہے اور نہ ہی اس میں باقاعدہ منتظم جدوجہد کا وہ تصور اپنے ذہن میں رکھتا ہے۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر فیمنزم کی اصطلاح اس قدر ڈھیلی ڈھالی ہے تو پر وہ کون سی خصوصیات ہیں یا وہ کون سے رجحانات ہیں جن کی بنیاد پر کس عمل یا تحریر یا شخص کو فیمنسٹ قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کا جواب دینا جب ہی ممکن ہے جب ہم ان تمام نظریات وخیالات میں کوئی مقام اتصال تلاش کر سکیں جو فیمنسٹ کہلاتی ہیں اور وہ نقطہ جہاں پر یہ اتصال ممکن ہے صرف ایک ہی ہے یعنی عورتوں کے حقوق کا حصول اور سوسائٹی کی hierarchy میں منصفانہ تبدیلی جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔

اس جدوجہد کے دورخ ہیں:

ا۔ فلسفانہ یا نظریاتی

۲۔ عملی

فیمنزم کے عملی رخ کی بات ہوتی ہے تو مغرب میں رونما ہونی والی تحریک ذہن میں آتی ہے جس کا اثر اردو ادب سمیت دنیا بھر کے علوم وفنون پر مرتب پر ہوا۔ مغرب میں فیمنزم کی اس تحریک کو عمونا نظریہ موج کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت نسائیت یا فیمنزم میں تین امواج نظر آتی ہیں۔

پہلی موج کا عرصہ انیسویں صدی سے بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول تک ہے اس عرصے میں عورتوں کی ملازمت، یکساں اجرت، جائیداد اور ملکیت کے حقوق، بیوی کی حقوق اور ووٹ کا حق جیسے مسائل کے عملی جدوجہد کرنی پڑی۔ دوسری موج کی عملی صورت ۱۹۹۶ سے ۱۹۹۸ کے درمیان واضح ہوئی۔ اس عرصے میں نجی اور گھریلو مسائل کو سیاسی مسائل قرار دیا گیا۔

کیرل ہائش "The personal is Political" کا نعرہ بلند کیا(۸)

اور عورتوں میں اس خیال کی ترویج و اشاعت کی گئی کہ ان کے نجی معاملات دراصل ایک سیاسی مسئلہ سے جڑے ہوئے ہیں۔ اسی دور میں آزادی نسواں کا تصور سامنے آیا۔ گھریلو کاموں، بچوں کی ولادت اور تربیت اور ضعفیوں کی خدمت جیسے کاموں کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے سوالات اٹھائے گئے۔ یہ مغربی فیمنزم کا عملی رخ تھا۔ لیکن یہ پہلا فیمنزم کے نظریاتی رخ سے پوری طرح جڑا ہوا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فیمنزم کی عملی تحریک کے پیچھے ان فلسفیانہ نظریات اور مباحث کا بڑا حصہ ہے۔ جو فیمنسٹ ادبیوں نے اپنی تصانیف میں پیش کیے اس لیے بہتر ہوگا کہ فیمنزم کے ارتقا کا مطالعہ نظریاتی اور فکری مباحث کے پس منظر میں بھی کیا جائے۔

فیمنزم کی تحریک کی ابتدا تو اٹھارویں صدی میں ہو چکی تھی مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد اس تحریک نے خاص طور پر زور پکڑا اور عملی کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ اس سلسلے کا پہلا اہم اظہار یہ ۱۸۹۲ میں شائع ہوا جیسے Mary Wallstone Craft نے شائع کیا تھا اس کا عنوان تھا۔

"A Vindicaton of the Rights of Women"(۹)

۱۸۴۵ میں مارگریٹ فلر نے (۱۰) "Woman in the Nineteeth Century" لکھی"

اس کے تین سال بعد ۱۸۴۸ میں مشہور Seneca Falls کنونشن میں عورتوں کے مساوی حقوق کا باقاعدہ مطالبہ کر دیا گیا۔(۱۱)

۱۸٤۹ میں جس کا john Staurt Mill کی مشہور کتاب The Subjection of Women شائع ہوئی ترجمہ افتخار شیروانی نے

عورتوں کی محکومیت کے عنوان سے کیا۔(۱۲)

اس کے بعد آزادی نسواں کا تصور تیزی سے مقبول ہوا۔

۱۹۲۰ میں بالآخر ایک آئینی ترمیم کے ذریعے امریکہ میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق مل گیا(۱۳)۔

تاہم اس کے بعد بھی مغربی معاشرے میں ملازمتوں میں عورتوں کی شمولیت محدود رہی۔ دوسری جنگ عظیم مغربی معاشرے میں عورت کا گھر سے تلاش معاش میں ایک معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔ بہ حالت مجبوری ملازمت تلاش کرنے والی عورتیں نچلے درجے کی نوکریوں پر کم اجرت پر رکھی جاتی تھیں یہ سب برداشت کرنے کے

بعد بھی بے کار دشواریاں اور سماجی و معاشرتی مسائل، ملازمت پیشہ عورتوں کی زندگی کو کٹھن بنانے اور عملی زندگی میں ان کی حوصلہ شکنی کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔(۱٤)

اس صورت حال میں ورجینیا وولف نے ایک طویل مضمون تحریر کیا جو بعد میں کتابی شکل میں شایع ہوا۔ A Room of ones own(۱۹۲۹)دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی ادیبہ سائمن ڈی بووا کی کتاب(۱۵) The second sexسامنے آئی۔

سائمن ڈی بووا نے عورت کے وجود سے متعلق کئی مباحث چھیڑے مثلاً یہ کہ عورت کیا ہے۔ کیا عورت کا وجود قائم بالذات ہے یا اضافی؟ کیا صنف مختلف کی موجودگی سے ہی اس کے وجود کا تعین ممکن نہیں ہے۔ اور اگر تذکیر کے بغیر تانیثیت کا وجود ممکن نہیں تو پھر اس قاعدے کی رو سے تذکیر بھی اپنے وجود کے لیے تانیثیت کی محتاج ہے۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ عورت ہی مرد کی نسبت سے کیوں پہچانی جاتی ہے اور مرد کے لیے عورت کی نسبت سے پہچانے جانا تذلیل کی بات ہے سمجھی جاتی ہے۔

اپنی دوسری کتابWomen Myth & Reality میں سائمن ڈی بو دانے عورت اور مرد کے روایتی تصور کو رد کر دیا ہے۔ اس کا خیال ہے مرد کو اپنی مردانگی اور عورت کو اپنی نسوائیت جتانے یا ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بجائے مرد اور عورت دونوں ہی اپنی انسانیت ثابت کریں تو بہتر ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں عورت نہیں ہوتی بن جاتی ہے۔(۱٦)

سائمن ڈی بو وا کو سارتر کے سائے سے نکالنے اور اس کا علیحدہ وجود ثابت کرنے کے لیے بھی فیمنسٹ نقادوں کو طویل عرصہ جدوجہد کرنی پڑی۔ بہر حال سائمن ڈی بودا کی تحریروں نے نسائیت کا وجودیت اور نفسیات سے جو رشتہ استوار کیا اسے بعد میں آنے والوں نے مزید مضبوط کیا۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں کئی فیمنسٹ تحریریں سامنے آئیں۔ بیٹی فرائدین کی

"The Feminie Mystique" کتاب ۱۹۶۳ میں شایع ہوئی اور اپنے عہد کی بے حد

مقبول کتاب رہی۔ (۱۷) بیٹی فرائڈ نے صدیوں پرانے اس معاشرتی تصور پر ضرب لگائی کے گھر اور بچوں کے ذریعے عورت کی تکمیل ہوتی ہے۔

اس کا خیال ہے کہ ہے۔

ایسے روایتی باطل تصورات کا شکار ہو کر عورت اپنی شناخت گم کر بیٹھتی ہے۔(۱۸)

اس کے بعد دیگر کئی کتابیں جلد ہی منظر عام پر آئیں جنھوں نے نسائیت کی بحث کو آگے بڑھایا مثال کے طور پر کی کتاب

Mary Ellman کی کتاب ۱۹۶۸ "Thinking about Women"(۱۹)

Katw Millet کی کتاب "Sexual Politice" ۱۹۶۹(۲۰)

Judith Fetterly کی کتاب "The Resisting Reader" ۱۹۷۷(۲۱)

ان مصنفین کے بعد تیسری موج شروع ہوتی ہے۔یہ تینوں امواج ایک دوسرے کا تسلسل ہیں۔فیمنزم کی اس تیسری موج میں جو آج تک جاری ہے اس میں کئی نظریاتی مباحث سامنے آئے ہیں اس عہد میں نسائیت فیمنزم کے تضادات اور الہامات پر انتخاک گفتگو کی گئی۔ تانیثیت کی ادبی نظریہ سازی میں ورجینا وولف کا نام ایک رہنما کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔وولف نے سیاسی، سماجی، معاشی اور ادبی یعنی ہر شعبہ حیات میں عورت اور مرد کے درمیان تفاوت اور تفریق پر بنی فکر ورجحان کو سراہت کرتے ہوئے پایا۔ وولف نے واضح کہا کہ گھریلو زندگی میں بیویوں اور بیٹیوں پر شوہروں اور والدین کے تسلط سے لے کر مذہبی معاملات میں بھی عورتوں کو مردوں کی محکومی اور تابعداری تفویض کی گئی ہے۔

اس طرح سامراجیت، نو آبادیات اور فاشزم جیسے نظریاتی مباحث میں بھی عورت کا مقام مردوں سے ایک زینہ نیچے ہی ہے۔ عورتوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے پیچھے کارفرما سب سے طاقتور مردمرکوزیت ہے۔

(Patriarchy) وولف نےAndrogyny کا بھی فلسفہ پیش کیAndrogyny یونانی لفظ ہے جو دو لفظوں کا مرکب ہے۔ یعنی"Andro" مرد اور "Gyny"یعنی عورت مطلب یہ کہ ایسا فرد جس کے اندر مردانگی اور نسوانیت دونوں موجود ہوں۔

ورجینا وولف نےTheeGuineas میں عورتوں کو ہدایت دی ہے کہ ایک ایسے سماج کی تعمیر و تشکیل کریں۔ جس سے مردمرکوزیت کے ڈسکورس کو چیلنج کیا جاسکے وولف نے اس کتاب میں ایسے حکام اور فتووں کی سخت مخالفت کی ہے جن کے باعث خاتون ادیبوں کو ادب کی شریعت سے باہر کر دیا جاتا ہے۔

وولف نے خواتین ادیبوں کی تخلیقات اور تصنیفات کی اہمیت اور قدر شناسی کے لیے خاتون ادیبوں کی گم شدہ متون کی تلاش اور تفہیم کے ساتھ تجزیے پر بھی زور دیا ہے۔Radical Feminism لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنیRootیعنی بنیاد کے ہیں۔ سماج میں موجودRadical Feminismمسائل کو اس کی جڑ اور بنیاد سے اکھاڑنے میں یقین رکھتے ہیں اس لیے یہ طبقہ بنیاد پرست کہلاتا ہے۔ بنیاد پرستانہ تانیثیت صنفی خطوط پر سماج کی تشکیل نو کے اصرار کے باعث لبرل اور مارکسی تانیثیت سے جداگانہ ہے۔

بنیاد پرست تانیثیت کے قائلین کا ماننا ہے کہ زوجگی محبت، شادی جنسی عمل اور گھریلو کام کاج کو بڑی مہارت سے معمول میں شامل کر لیا گیا ہے۔ تانیثیت کی تمام تجویز مثلاً ایکو فیمنزم بلیک فیمنزم، ایلامک فیمنزم کی قدر میں تقریباً یکساں اور مشترک ہیں۔ سماج کے جس ڈھانچے میں جہاں کہیں بھی عورت کے ساتھ کسی بھی نوعیت کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا اور حقوق نسواں کی آگہی عام کرنا ہی دراصل تمام تھیوریز کا محور ہے۔ شرم وحیا کے باعث ایک عرصے تک عورتیں اپنے ساتھ ہونے والے استحصال کا برملا اظہار کرنے سے بھی گریزاں تھیں۔ لیکن اب بیداری عام ہوئی ہے کہ عورتوں نے اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتی کے خلاف کھل کر اظہار کرنا شروع کر دیا ہے۔

نسائی ادب کی روایت:

تذکرہ چمن انداز ۱۸۷۸ (۲۲) میں شائع ہوا۔ یہ اولین تذکرے ہیں جن میں خواتین کے نام نظر آتے ہیں۔ گویا اردو شعر وادب کی چار سو سالہ تاریخ میں ہی عورتوں کا کوئی قابل ذکر مقام متعین نہیں کیا گیا تھا۔

تعلیم نسواں کی تحریک:

جنوبی ایشیا میں عورت کی تعلیم، خصوصا مسلم گھرانوں میں عورتوں کی تعلیم کا جو رہا سہا رواج تھا وہ بھی انگریزوں کی اس خطے میں آمد کے بعد دم توڑ گیا۔ جہاں کمسنی کی شادی اور پردے کی بے جا پختیوں نے عورتوں کی تعلیم کے راستے اور مشکل کر دیے تھے وہیں ایک سبب یہ بھی تھا کہ مسلمان جدید تعلیم خصوصا، عورتوں کی تعلیم سے خائف تھے جیسا کہ سر سید احمد خان نے اپنی مشہور کتاب اسباب بغاوت ہند میں تحریر کیا ہے کہ

> لوگ یقین جانتے ہیں کہ سرکاری تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکولوں میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں۔ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا۔(۲۳)

غرض یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے جنوبی ایشیاء کی عورتیں خصوصا مسلم گھرانوں کی عورتیں تعلیمی پس ماندگی کا شکار ہو گئیں۔ تنگ نظری اور رجعت پسندی ایسی عام تھی کہ عورت تو عورت مردوں نے جدید تعلیم کے دروازے اپنے اوپر بھی بند کر لئے تھے۔ اس صورت حال میں پہلی تبدیلی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر نظر آئی۔ سر سید احمد خان کے صاحبزادے سید محمود جب لندن سے تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تو انہوں نے مسلمان عورتوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ ہر چند کہ اس موقع پر خود سر سید احمد خان نے اس کی مخالفت کی تھی تاہم ۱۸۸۹ء

کے بعد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ہر اجلاس میں عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ شد و مد سے اٹھایا گیا تھا[٢٤]۔ بالاخر ١٨٩٩ء میں سیا امیر علی کی کوششوں سے کانفرنس میں عورتوں کی تعلیم کی قرارداد منظور کرلی گئی۔ یوں سرسید تحریک کے زیر اثر پہلی مرتبہ عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ زور و شور سے زیر بحث آیا۔ سرسید احمد خان کی تمام تر توجہ مردوں کی تعلیم پر مرکوز ہونے کے باوجود سرسید کی تحریک سے ہی ایسے لوگ سامنے آئے جنہوں نے تعلیم نسواں کو باقاعدہ تحریک کی صورت دے دی۔

تعلیم نسواں کے سلسلے میں جہاں سید محمود اور جسٹس امیر علی نے عملی کام کیسے وہاں سرسید کے اپنے رفقاء نے ادب کا سہارا لے کر عورتوں کے مسائل پر توجہ مبذول کروائی اور بیداری کا پیغام دیا۔ نذیر اور حالی اس حوالے سے خاص اہمیت رکھتے ہیں نذیر احمد دہلوی اردو کے پہلے ناول نگار ہی نہیں عورتوں کی تعلیم کے لئے کام کرنے والے پہلے ادیب بھی ہیں۔ ان کے اولین ناول "مراۃ العروس[٢٥] اور " بنات النعش[٢٦] عورتوں کی تعلیم کی غرض سے ہی لکھے گئے۔ اسی عرصے میں سرشار اور شرر بھی ناول نگاری کے میدان میں آئے اور عورتوں کی تعلیم کو موضوع بنایا۔ سرشار کے ناول"فسانہ آزاد(٢٧) میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں مثبت خیال نظر آتے ہیں۔ شرر نے اگرچہ تاریخی ناول لکھے لیکن ان کا ناول " بدر النساء کی مصیبت (٢٨) عورتوں کی اصلاح اور پردے کی بے جانتی پر لکھا گیا۔ حالی نے تعلیم نسواں کے موضوع پر کتاب "مجالس النساء تحریر کی۔ ١٨٧٠ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں عالی نے نظم " " چپ کی داد " کے عنوان سے پڑھی اور اس میں عورتوں کی تعلیمی اور تہذیبی حالت زار کا نقشہ بڑی دردمندی کے ساتھ پیش کی۔(٢٩)

سرسید احمد خان کے بعض دوسرے ساتھیوں ذکا اللہ، مولوی چراغ علی محسن الملک اور شبلی نے بھی تعلیم نسواں کی حمایت میں مضامین لکھے اور تقاریر کیں۔ اسی دوران علی گڑھ کے تعلیم سے جاری کیا۔(۳۰) ۱۹۰۹ء میں رسالہ شریف بی بی لاہور سے اور اسی سال الحجاب بھوپال سے جاری ہوا۔(۳۱) ان سب رسائل کا بنیادی مقصد تعلیم نسواں کا فروغ تھا اور ان میں سے بعض کی ادارت بھی خواتین کے ذمہ تھی اس پورے عرصے میں انگریز مشنری اسکول تو کام کر ہی رہے تھے۔ ان اسکولوں کے مقابلے میں ہندو اور مسلمان تنظیموں نے مدارس کھولنے کا ارادہ کیا۔ دوسری طرف قانونی سطح پر بھی عورتوں کے حقوق کی بات کی جارہی تھی۔ ۱۸۲۹ء میں ستی کی رسم ممنوع قرار دی گئی تھی۔(۳۲) ۱۹۲۹ء میں بچپن کی شادی پر پابندی لگائی گئی۔[۳۳] ۱۹۳۹ء میں مسلمان عورتوں کے لیے ضلع کا حق بھی تسلیم کر لیا گیا ۱۹۱۹ء میں عورتوں کو ووٹ کا حق مل چکا تھا۔(۳٤)

ان سب حالات و واقعات نے اس خطے کی عورت کی زندگی تبدیل کر دی۔ اسے بچپن کی شادی سے نجات ملی۔ گھر سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا اور وہ بہت جلد اپنے احساس و جذبات کا اظہار خود کرنے لگی۔

اصلاحی نسائیت

تعلیم نسواں کی جس تحریک کا اوپر تذکرہ کیا گیا اس کے نتیجے میں عورتوں کا ایک گروہ سامنے آیا جو تعلیم یافتہ تھا۔ ان تعلیم یافتہ خواتین نے معاشرے کی دیگر خواتین کی بیداری اور اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس مقصد کے لئے خواتین نے فکشن کے میدان میں قدم رکھا۔ افسانہ اور ناول تحریر کئے اور کہانی کے ذریعے عورت کے شعور کی آبیاری کی۔

یہ خواتین تخلیق کار شاید مروجہ اصطلاحی مفہوم میں فیمنسٹ نہ کہلائی جاسکیں کیونکہ نہ ہی ان کے خیالات کا انداز باغیانہ تھا اور نہ ہی یہ پدر سری معاشرے یا عورتوں کی محکومی کے خلاف آواز بلند کر رہی تھیں ان کا مقصد تو صرف اس عہد کے نسوانی معاشرے کی اصلاح تھا۔ یہ عورتیں، معاشرے کی دوسری عورتوں کے ساتھ ایک نوعیت کا بہناپا رکھتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ جس طرح یافتہ نوجوانوں نے تعلیم نسواں کے مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شیخ عبد اللہ اور سجاد حیدر یلدرم نے اس سلسلے میں عملی کوشش کی۔

شیخ عبد اللہ نے مسلمان عورتوں کی تعلیم کے لئے بے حد فعال کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں ان کی اہلیہ نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ۱۸۹۰ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ جو تعلیم نسواں کیلئے قائم کی گئی اس کے سیکریٹری شیخ عبد اللہ ہی تھے۔ ۱۹۰۴ میں انہوں نے اہلیہ کے ساتھ مل کر رسالہ خاتون جاری کیا۔ ۱۹۰۴ء میں لڑکیوں کا ایک اسکول علی گڑھ میں اعلی بی، بیگم شیخ عبد اللہ کی کوششوں سے قائم ہوا جو بعد میں ترقی کر کے کالج کے درجے تک پہنچا اور ۱۹۳۶ء میں یونیورسٹی سے ملحق ہوا"۔(۳۵)

سجاد حیدر یلدرم نے بھی تعلیم نسواں پر مضامین تحریر کیے۔ مولوی ممتاز علی کا نام بھی اس سلسلے میں اہم ہے۔ ان حالات میں ایسی خواتین بھی سامنے آئیں جنہوں نے تحریری اور عملی طور پر تعلیم نسواں کی تحریک میں حصہ لیا۔

ان خواتین میں سب سے اہم نام بھوپال کی سلطان جہاں بیگم کا ہے۔ سلطان جہاں بیگم بھوپال کی ملکہ نے اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ سلطان جہاں بیگم نے تین مدرسے قائم کیے تھے۔ مدرسہ وکٹوریہ مدرسہ بلقیسہ اور مدرسہ سلطانیہ۔ اس کے علاوہ ایک کتب خانہ "کتب خانہ حمیدیہ بھی قائم کیا۔ ۱۹۰۷ء میں سلطان

جہاں بیگم نے ایک مدرسہ اپنی ریاست کی ہندو لڑکیوں کے لئے بھی قائم کیا۔ مدرسہ آصفیہ کا قیام بھی بیگم بھوپال مرہون منت ہے۔ جہاں ڈاکٹری اور طب یونانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔(٣٦)

اس جگہ ان اردو رسائل و جرائد کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لئے جاری کیے گئے۔ ۱۸۸۴ء میں محبت حسن نے دکن سے معلم رسالہ جاری کیا۔[٣٧] ۱۸۹۸ء میں ممتاز علی کا مشہور رسالہ تہذیب نسواں جاری ہوا۔[٣٨] ۱۹۰۴ء میں شیخ عبد اللہ نے علی گڑھ سے خاتون رسالہ نکالا[٣٩] اور ۱۹۰۸ء میں علامہ میں گودڑ کالال سب سے زیادہ مقبول ہوا۔

قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں کہ

> گورز کالال غالباً ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ چھپتے ہی دھوم مچ گئی۔ بہت جلد مڈل کلاس مسلمان عورتوں کی بائبل کی حیثیت اختیار کرلی۔ لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا۔(٤٠)

اس ناول میں نہ صرف پردہ کی بے جا پابندیوں کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے بلکہ مسلم لڑکیوں کے مخلوط تعلیم کا تصور بھی ملتا ہے۔ نذر سجاد، اردو کے پہلے افسانہ نگار اور تعلیم نسواں تحریک کے فعال رکن، سجاد حیدر یلدرم کی بیگم اور مایہ ناز ناول نگار قرۃ العین حیدر کی والدہ ہیں۔ انہوں نے بہت نذر الباقر کے نام سے جو لکھنا شروع کیا۔ ان کے افسانے مضامین اور ناول اس زمانے کے مشہور رسائل "تہذیب نسواں ١٩١٠ء خاتون اور عصمت میں شائع ہوئے۔ اختر النساء بیگم نذر سجاد کا پہلا ناول ہے، جو ء میں انہوں نے صرف چودہ سال کی عمر میں لکھا۔ جاں باز (۱۹۱۸ء) سے عصمت میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوا اور ۱۹۳۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ ان کے دیگر ناول آہ مظلوماں (۱۹۱۴ء)، ثریا(۱۹۳۰) نجمہ (۱۹۳۹ء) اور حرماں نصیب ہیں۔(٤١)

مولانا رزاق الخیری، نذر سجاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

اگر یہ بحث چھڑے کہ عورتوں میں کسی نے سب سے پہلے اپنی جنس کی مظلومیت اور بے چارگی پر آنسو بہائے اور ان کے شرعی حقوق کے حصول کی انتھک کوششیں کیں عظیم المرتبت بلند پایہ لکھنے والوں میں اردو کی کونسی مصنفہ ہے جس کی ساتھ برس کی تحریروں میں کتنا ہی تلاش کیا جائے مشرقی شرافت کے خلاف کوئی ایسا لفظ نہ نکلے گا جس سے نسوانی وقار مجروح ہو توان سوالوں میں صرف ایک نام لیا جائے۔

ان کی زندگی تعلیم کے ذریعے تبدیل ہوگئی اسی طرح دوسری عورتوں کی زندگی بھی تبدیل ہو جائے یوں لاشعوری طور پر سہی، وہ ایک بڑی تبدیلی کی خواہاں تھیں۔ وہ جانے انجانے میں مستقبل کی فیمنسٹ آوازوں کے لئے راہ ہموار کر رہی تھیں، اور اسی لئے ہم نے اس عہد کو اصلاحی نسائیت کا عہد قرار دیا ہے۔

تعلیم نسواں کی تحریک کے نتیجے میں شعر و ادب سے تعلق رکھنے والی کئی خواتین کے نام منظر عام پر آگئے۔ ان خواتین میں بیشتر نثر نگار ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں اصلاحی مضامین اور گھریلو افسانے کے ذریعے خواتین کا منظر عام پر آنا ممکن ہو گیا تھا لیکن چونکہ شاعری کا تعلق عموماً عشقیہ جذبات سے رہا ہے اس لئے خوتین کی شاعری ایک معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔

نثر کے حوالے سے اس دور میں رشیدۃ النساء محمدی بیگم، نذر سجاد، جمیدہ بانو، مسز عبد اللہ سلطان بیگم، بیگم ممتاز علی، عطیہ فیضی، صغری ہمایوں، کنیز فاطمہ، نجستہ اختر، این حسن بیگم، بیگم شاہنواز، طیبہ بیگم، ضیا بیگم، صالحہ عابد حسین کے نام ادبی منظر نامہ پر نظر آنے لگے۔ ان میں اکثر خواتین کا تعلق افسانوی ادب سے تھا۔

رشیدۃ النساء بیگم پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ناول نگاری کی طرف توجہ کی۔ ان کا ناول اصلاح النساء ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا۔ سید وقار عظیم نے اس کو خواتین کا لکھا ہوا پہلا ناول قرار دیا ہے۔(٤٢) اس ناول میں ہندوستانی خواتین کی ایسی رسموں اور جھگڑوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو شریف خاندانوں کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ ناول کی زبان سلیس وعام ہے اور مسلم گھرانوں کی معاشرت پر عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اکبری بیگم نے اپنا ناول "گلدستہ محبت عباس مرتضی کے فرضی نام سے پبلک پریس مراد آباد سے چھپوایا۔ اس کے بعد والدہ افضل علی کے نام سے اس دور کے رسائل میں لکھنا شروع کیا۔ "عفت نسواں شعلہ پنہاں" اور "گودڑ کا لال ان کے بقیہ تین ناول ہیں۔

محمدی بیگم، سید ممتاز علی کی بیگم اور تہذیب نسواں کی ایڈیٹر تھیں۔ ان کے مضامین تہذیب نسواں اور دیگر رسائل میں شائع ہوا کرتے تھے۔ محمدی بیگم نے صفیہ بیگم " آج کل اور شریف بیٹی کے نام سے تین ناول لکھے۔ ان ناولوں میں بھی تعلیم نسواں کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اسی دور میں کئی دیگر خواتین ناول نگار سامنے آئیں۔ الف ض حسین بیگم نے روشنک بیگم، عباسی بیگم نے زبیدہ بیگم، حمیدہ سلطان مخفی نے "ثروت آرا بیگم، بیگم شاہنواز نے حسن آرا، ظفر جہاں بیگم نے "اختری بیگم، طیبہ بیگم نے " انوری بیگم، اور ب سدید نے بیاض سحر کے نام سے ناول لکھے۔ فاطمہ بیگم، جنہوں نے شریف بی بی کے نام سے ایک رسالہ بھی مرتب کیا، کئی مضامین خواتین کے حقوق کی حمایت میں، اس دور کے جریدوں میں تحریر گئے۔ اور صبر کا پھل وفائے مغرب اور غیرت کی پہلی وغیرہ کہانیاں لکھیں ۔(٤٣)

سارا بیگم ۱۳۱۱ھ میں پیدا ہوئیں ماتم سروش" کے نام سے اپنے بھائی ابو نصر فتح کے حالات قلم بند کئے جو جوانی میں فوت ہوگئے تھے۔ اساس القواعد" اور " انسداد گداگری آپ کی تصانیف ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن رابعہ بیگم

اردو شاعری اور نثر نگاری میں دلچسپی لیتی رہیں اور اس دور کے معیاری رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوئے ۔(٤٤) صغری بیگم ۱۸۸۴ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا

ہوئیں۔(٤٥)

ترقی پسند تحریک سے قبل کی ادیب خواتین میں مقبول و معروف مصنفہ ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد تقریبا پندرہ ہے۔ ان کی سرپرستی میں ایک نسوانی رسالہ "زیب النساء بھی جاری ہوا۔ صغری بیگم ہمایوں نے نہ صرف کئی اصلاحی و معاشرتی مضامین لکھے بلکہ عملی اقدامات بھی کئے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ مقالات صغری کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ سرگزشت ہاجرہ ان کا مقبول ترین ناول ہے۔ اس دور کی روایت کے مطابق ان کے افسانے اور ناول اصلاحی رنگ لئے ہوئے تھے۔

ترقی پسند تحریک سے قبل کی خواتین مصنفین میں ایک اہم نام حجاب امتیاز علی کا ہے۔ حجاب امتیاز علی کی ساس"" محمدی بیگم (والدہ امتیاز علی تاج) اردو کی اولین خواتین ناول نگاروں میں سے ہیں۔ حجاب امتیاز علی نے شادی کے بعد گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ تہذیب نسواں کی ادارت بھی کی اور افسانہ نگاری کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ حجاب امتیاز کا پہلا افسانہ ناتمام محبت ہے(٤٦)۔ جو مصنفہ کے بیان کے مطابق ساڑھے گیارہ برس کی عمر میں لکھا گیا۔ حجاب امتیاز علی کے بیشتر افسانوں پر چھائی نظر آتی ہے۔ نغمات محبت، خلوت کی انجمنیں رین تھے اور شگوفے اور پاگل خانہ وغیرہ حجاب امتیاز علی کی دیگر افسانوی تصانیف ہیں۔ خصوصاً ان کا ناول 'پاگل خانہ اعلیٰ درجہ کا ناول ہے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ نثر کے میدان میں اصلاح و مقصدی کہانیوں کے توسط سے داخل ہونا آسان تھا۔ شعر پنجبن کے کارزار میں اظہار صداقت کے ساتھ قدم رکھنا عورت کے لئے آج بھی آسان نہیں تو اس دور میں کیسے

ممکن تھا۔اس کے باوجود شاعری کی سطح پر چند نام نظر آجاتے ہیں، جنہوں نے ترقی پسند تحریک سے قبل،روایات سے ایک طرح کی بغاوت کی اور شریف خاندانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود شعر کہے۔اس سلسلے میں اہم نام سعادت بانو کیلو کا ہے۔سعادت بانو کیلو، ۱۰ جنوری ۱۸۹۳ء کو امرتسر میں پیدا ہوئیں[٤٧]۔گھر میں ہی اردو فارسی میں مہارت حاصل کی اور انگریزی زبان سیکھنے کی طرف بھی توجہ دی۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ ان میں شمس العلماء مولانا آزاد، گردش زمانہ اور سرسید مرحوم، خصوصی طور پہ اہمیت کے حامل ہیں اور مصنفہ کے وسیع مطالعہ کے ترجمان ہیں۔ سعادت بانو نے اردو اور فارسی کلاسیکی شعرا کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ سرسید تحریک کے زیر اثر نیچرل شاعری کی طرف توجہ کی۔ان کی تمام تر نظمیں حب الوطنی کے جذبات سے پر ہیں۔ان کی نظم تاروں سے گفتگو" اور "اسیر قفس ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئیں۔اسیر قفس اقبال کی نظم "ایک پنجرے میں کی تضمین ہے۔اس کے اشعار اس طرح ہیں۔

اے دل کسے سناؤں میں غم بھرا افسانہ

گلشن سے اب قفس میں میرا ہوا ٹھکانہ

رنج والم سے دل پر لگتا ہے تازیانہ

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

سعادت بانو ۱۹۱۵ء میں سیف الدین کچلو کی رفیقہ حیات بنیں۔۱۸ اگست ۱۹۷۰ء میں یہی سعادت بانو بے کسی اور مفلسی کی حالت میں خالق حقیقی سے جاملیں۔ شاعرات میں زاہدہ خاتون شروانیہ کا نام اپنے دور کا سب سے

نمایاں نام ہے۔ گھر پر تعلیم حاصل کی۔ عربی اور فارسی پہ کمال کا عبور رکھتی تھیں۔ زر خ ش کے نام سے ان کی نظمیں اس دور کے مشہور رسائل میں شائع ہوئیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ فردوس تخیل ان کی وفات کے بعد ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں صرف زر خیش ہی ایسی خاتون ہیں جو بحیثیت شاعر فی الواقع بلند مقام پر فائز ہیں اور گرد و پیش کی سیاسی و سماجی زندگی کے بارے میں اپنی باغیانہ سوچ کو نہایت دردمندی اور تہ داری کے ساتھ شاعری میں پیش کرتی ہیں۔ ز۔ خیش نے مزدور، قید فرنگ اور خواتین کے مسائل پر نظمیں کہیں۔ عروج اسلام کے زمانے میں مسلم خواتین کے کارناموں کے کارناموں کا ذکر یوں کیا ہے کہ:

ہم تھے اُس عہد ہمایوں میں نہ یوں مشق ستم

بے دل و روح اندھا دھند نہ کہلاتے تھے ہم

قفس محشت میں گھٹ گھٹ کے نکلتا تھا نہ دم

ہم نے کھائی تھی نہ یوں گھر سے نکلنے کی قسم

منو مفلوج کی مانند نہ بیکار تھے ہم

حسین رائے پوری اور پروفیسر مجنوں گورکھپوری، علامہ نیاز کے زیر اثر خاص طور پر آگے بڑھے۔ ان سب کوششوں کا نتیجہ یہ کہ ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ ادیبوں کی ایک تنظیم انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے سامنے آگئی اور اس کی بنیاد رکھنے والوں میں اور بحیثیت قلم کار ہاتھ بٹانے والوں میں مردوں کے دوش بدوش نہیں بلکہ مردوں سے آگے بڑھ کر نام کرنے والوں میں خواتین کے نام ہیں۔

شعر و ادب کے حوالے سے ترقی پسند تحریک بے حد اہم تحریک ہے اور اس کا ذکر آئندہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ کیا جائے گا۔ اس سے پہلے اس وقت یہاں شہر کراسی دور میں زور پکڑ لینے والی تحریک آزادی کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔

تحریک آزادی کی نسائی آوازیں

خواتین کی بیداری کی یہ لہر جو علی گڑھ تحریک کے زیر اثر بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں بروئے کار آئی اس کا سیاسی پس منظر دیکھئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہ دور تھا جب آزادی کی تحریک روز بروز زور پکڑتی جارہی تھی، دو قومی نظریے کی تحریک چل پڑی تھی، اور سر سید احمد خان کی بنا کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ وجود میں آئی، جن کے نتیجے میں دو قومی نظریہ کی تحریک آگے بڑھی یہاں تک کہ ۱۹۰۹ء میں لاوڈ منومارلو اصلاحات کے تحت حکومت برطانیہ نے بھی مسلمانوں کے اس مطالبے کو مان لیا کہ ہندو مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ چند سال بعد ۱۹۱۶ء میں لکھنو پیکٹ وجود میں آیا اور اس پیکٹ کے تحت کانگریس نے بھی دو قومی نظریے کو تسلیم کر لیا۔

اسی زمانے میں ایم اے او کالج کو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا چارٹر دلوانے کی تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی بھرپور حصہ لیا اور دسمبر ۱۹۲۰ء میں مسلم لیگ یونیورسٹی علی گڑھ، با قاعدہ وجود میں آئی۔ (٤٨) ایم۔ اے او کالج کے بعض سابق طالب علموں نے جن میں محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین پیش پیش تھے علی گڑھ یونیورسٹی کے متوازی ایک نئی یونی ورسٹی کی داغ بیل ڈالی، یہ یونی ورسٹی جامعہ ملیہ دہلی کے نام سے قائم ہوئی۔ انہی دنوں میں حیدر آباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہوا۔ (٤٩)

اس کا ذریعہ تعلیم ہر سطح پر اردو تھا۔ گویا چند سال کے اندر ہی تین بڑی جامعات مسلمانوں کی توجہ سے، حیدر آباد علی گڑھ اور دہلی میں قائم ہو گئیں۔ ادھر پنجاب سرحد، اور سندھ میں اسلامیہ کالج لاہور اسلامیہ کالج پشاور اور سندھ مدرستہ الاسلام" وغیرہ وجود میں آ چکے تھے۔ ان میں بعض اداروں نے مخلوط تعلیم کی اجازت دی اور بعض نے خواتین کے لئے علیحدہ تعلیم کا انتظام کیا۔ ان سب کا اثر یہ ہوا کہ مسلم خواتین کی اچھی تعداد، نہ صرف اسکولوں کی سطح پر بلکہ کالج کی سطح پر بھی پہنچ گئی اور وہاں سے فارغ پر اور التحصیل ہو کر شعر و ادب کی دنیا میں بھی انہوں نے اپنا کردار ادا کیا۔

تعلیم و تدریس کے ان اداروں کی تاسیس و توسیع کے ساتھ ساتھ پورے برصغیر میں بیداری کی لہر موجزن تھی۔ اس دور کی صحافت کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ حسرت موہانی کے اردوئے معلی عبد الحلیم شرر کے دلگداز محمد علی کے رسالے ہو درو" اور "کامریڈ مولانا ابو الکلام آزاد کے رسالے "الہلال اور مولوی ظفر علی خان کے زمیندار نے صحافت میں دھوم مچائی ہوئی تھی۔ ادبی پرچوں میں شیخ عبد القادر کا مخزن لاہور، منشی ویا نرائن علم کا زمانہ کانپور، ظفر علی خان کا دکن ریویو"، ظفر الملک علوی کا" الناظر منشی نوبت رائے نظر کا ادیب اور تاجور نجیب آبادی کا" ہمایوں جیسے رسائل نے سیاسی و تہذیبی زندگی میں زبردست شور و غونا پیدا کر رکھا تھا۔ اقبال کی نظموں میں "شکوہ" "جواب شکوہ" اور پہلی جنگ عظیم کے فورا بعد طلوع اسلام اور خضر راہ نے بھی مسلمان مرد و خواتین کے جذبات میں ایک تموج پیدا کر دیا تھا۔

اسی دور میں نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت موہانی) علم وادب، شعر و سخن اور سیاست و معاشرت، سب حوالوں سے میدان میں آ گئیں۔ نشاط النساء بیگم گھر کی تعلیم یافتہ تھیں لیکن انہیں عام رواج کے مطابق صرف مذہبی

تعلیم ہی نہیں دلائی گئی تھی بلکہ مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم بھی دلائی گئی۔ شادی ہونے سے قبل تک آپ کا خاص مشغلہ یہ تھا کہ پس ماندہ قصبے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں اور بقول شخصے اگر آج موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط النساء بیگم کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے۔(۵۰)

گویا نشاط النساء بیگم میں حسرت موہانی جیسی شخصیت کا ہمسفر بننے کی صلاحیت پہلے ہی موجود تھی۔ مولانا حسرت موہانی اور علی گڑھ تحریک کی قضاء نے اس صلاحیت کو مزید جلا بخشی اور انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو ایک نوجوان خاتون کی حیثیت میں شاید ہی کسی نے انجام دیے ہوں۔

نشاط الفساء" پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے آزادی کا علم بلند کیا۔ مولانا محمد علی کی والدہ (آبادی بیگم) بیگم حسرت موہانی کے بعد ہی جنگ آزادی میں شامل ہوئیں۔(۵۱) نشاط النساء بیگم غالبا ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۰۸ء میں جب حسرت موہانی کو گرفتار کیا گیا تو بیگم حسرت موہانی عملی طور پر سیاست کے میدان میں آگئیں۔ وہ رام ، راج اور تصورات کو رد کر کے باقاعدگی سے حسرت سے ملنے کے لئے جیل جاتی رہیں۔ ۱۹۱۹ء میں جب حسرت موہانی کو دوبارہ گرفتار کیا گیا تو نشاط النساء بیگم نے پردہ ترک کیا اور حسرت کے مقدمات کی پیروی کے لیے گھر سے باہر آگئیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں کہ

> بیگم حسرت پہلی مسلم خاتون ہیں جنہوں نے ایک مقصد کے لئے پردہ ترک کیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں تھیں اکتیس سال کی جوان عورت کے لئے برقعہ اتارنے کے لئے بڑی ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ یہ کام اپنی عزم رکھنے والی خاتون نشاط النساء بیگم ہی کر سکتی تھیں۔(۵۲)

بیگم حسرت نے نہ صرف حسرت کے مقدمات کی پیروی کی بلکہ وہ سیاسی جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتی تھیں۔ ساتھ ساتھ انہوں نے اخبارات کے ذریعے عوام کو حسرت کے حالات سے باخبر رکھا اور اپنے عہد کے بڑے سیاسی رہنماؤں سے خط و کتابت کے ذریعے مسلسل رابطہ بھی برقرار رکھا اور اس طرح بقول تحقیق احمد صاحب بڑی ہمت کے ساتھ پبلک ریلیشن آفیسر کی خدمات انجام دیں۔(۵۳)

بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا کہ نشاط النساء بیگم کا تعلق صرف حسرت کی سیاسی زندگی سے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ حسرت کے ادبی کاموں میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ حسرت ان کو غزلیات سناتے جس پر وہ تبصرہ کرتی تھیں۔(۵۴) حسرت کی گرفتاری کے دوران انہوں نے حسرت کے چھ داوین (پنجم تا دہم) مرتب کر کے شائع کئے اور ان کے اشاعتی ادارے کو کسی نہ کسی طرح فعال رکھا۔ ان کے سفر حج کے دوران اپنی بیٹی کو لکھے گئے خطوط حسرت نے سفر نامہ عراق و حجاز" کے عنوان سے اردوئے معلی میں دو قسطوں میں شائع کئے اور اس پر دو صفحات کا دیباچہ یا پیش لفظ "تنقید رسائل کتب کے نام سے تحریر کیا۔

حسرت کے رسالے اردوئے معلّی کے اجراء میں، اسے کسی نہ کسی طور پہ جاری رکھنے میں حسرت کی زندانی شاعری کو محفوظ کرنے میں، ان کے سیاسی مضامین کو شائع کرانے میں، ان کے کلام کے مجموعے شائع کر کے دوسروں تک پہنچانے میں اور حسرت کے دیگر علمی و ادبی کام ان میں بیگم حسرت نے جس طرح حسرت کا ہاتھ بٹایا اس کا سب ہی نے اعتراف کیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلے کی نکل سکے۔(۵۵)

نشاط النساء بیگم کا انتقال ۱۸ اپریل، ۱۹۳۷ء کو ہوا۔ حسرت نے بیگم کے انتقال پر بیگم حسرت کے نام سے مضمون شائع کیا۔ اس کے بعد اب تک نشاط النساء پر متعدد کتابیں اور درجنوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے جن کارناموں کا یہاں سرسری تذکرہ کیا گیا، وہ سب بیگم خورشید خواجہ (۱۹۸۱۔۱۸۹۶) کے والد سمیع اللہ خان سر سید احمد خان کے قریبی ساتھیوں میں تھے اور ان کے شوہر علی گڑھ کے مشہور بیرسٹر اور جنگ آزادی کے نامور مجاہد خواجہ عبدالمجید صاحب تھے۔ شادی کے بعد خورشید بیگم نے پردہ ترک کر دیا اور تحریک آزادی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔

زلیخا بیگم مولانا ابوالکلام آزاد کی بیگم تھیں۔ انہوں نے ساری زندگی آزادی کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیا اور ۱۹ اپریل ۱۹۴۳، گو جب کہ آزاد جیل میں تھے اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔ زبیدہ بیگم داؤدی (پیدائش اکتوبر ۱۸۸۵ء) بہار کے مشہور ایڈوکیٹ اور سیاسی رہنما شفیع داؤدی کی بیگم تھیں۔ زبیدہ بیگم پردہ نشیں خاتون تھیں مگر شوہر کے ہمراہ نہ صرف یہ کہ عوامی جلسے میں شریک ہوتیں بلکہ خود بھی خواتین کے جلسے منعقد کرتی تھیں۔ مولانا داؤدی کی کانگریس سے علیحدگی اور ۱۹۳۷ء میں احرار پارٹی کی شکست کے بعد مولانا داؤدی اور زبیدہ بیگم نے بقیہ زندگی خامشی سے گزاری۔ کنیز سیدہ بیگم میزو بیگم عصمت آراہ بیگم صغری خاتون وغیرہ کے نام بھی تحریک آزادی میں حصہ لینے والی اہم مسلمان خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔

خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کے جرنل ۶۳ تا ۶۸ میں ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کا ایک طویل اور قابل قدر مقالہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ شائع ہوا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کی جنگ چونکہ ساتھ لڑی گئی اس لئے اس مقالے کا عنوان حقیقتاً برصغیر کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ ہونا چاہیے تھا اور ان خواتین میں ان کا ذکر بھی شامل ہونا چاہیے تھا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے آزادی کی تحریک میں شامل ہوئی

تھیں۔ لیکن اس میں عموماً ایسی خواتین کا ذکر کیا گیا ہے جو کانگریس سے وابستہ رہیں۔ اس سلسلے میں درجنوں مسلم خواتین کا تذکرہ آیا ہے اور یہ تذکرہ جیسا کہ مقالے کے عنوان سے ظاہر ہے کہ سیاسی حوالے سے ہے۔

تاہم انہوں نے چند ایسی خواتین کا تذکرہ بھی کیا ہے جو شعر وادب سے وابستہ تھیں

اس سیاسی فضا کے ساتھ ساتھ بلکہ اس فضا سے منسلک ایک اور ثقافتی ولسانی تحریک سامنے آئی اور اس میں بھی مسلمان عورتوں اور مردوں نے بہت فعال کردار ادا کیا۔ ہوا یہ کہ اس دور میں جب تحریک آزادی زوروں پر تھی متعصب ہندوؤں نے اس گنگا جمنی تہذیب یا ہندولسانی تہذیب کو، زندگی کی ہر سطح پر نظر انداز اور پامال کرنا شروع کر دیا نظر انداز کر دیا جو مسلمانوں کے ہندوستان میں آمد کے بعد پیدا ہوئی تھی اور جس کی سب سے واضح نشانی "اردو تھی۔ اسی مشترکہ تہذیبی علامت یعنی اردو کے خلاف ہندوؤں۔ حکومت نے باقاعدہ تحریک شروع کر دی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا اردو کو فارسی رسم الخط کے بجائے ناگری رسم الخط میں لکھا جائے اور اسے اردو کے بجائے ہندوستانی یا ہندی کہا جائے۔ ظاہر ہے یہ مطالبہ مسلمانوں کے ثقافتی اور تہذیبی وجود پر چھری چلانے کے مترادف تھا اس لیے مسلمان کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے اور جب کانگریس کے زعماء کی طرف سے یہ اعلان ہونے لگا کہ اردو، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو پھر مسلمانوں نے اس کو اپنانے، اس کا تحفظ کرنے اور اس کو ترقی دینے کی ذمے داریاں بھی قبول کر لیں۔

انجمن ترقی اردو (قیام ۱۹۰۳ء) کا صدر دفتر جو ابھی تک اورنگ آباد (دکن) میں تھا، اسے مولوی عبدالحق ۱۹۳۷ء میں دہلی لے آئے اور اردو کی ترویج واشاعت اور مسلمانوں کے تہذیبی وسماجی اور سیاسی ترجمان کی حیثیت سے سہ ماہی اردو ماہنامہ " قومی زبان کے ساتھ ہفت روزہ منشور کا بھی اجراء کر دیا۔ منشور کے پہلے ایڈیٹر مولانا حسن

ریاض مقرر ہوئے۔ انجمن کے دہلی آ جانے کے بعد تالیف و تصنیف کے کام کو بھی فروغ ہوا اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیان متعدد تحقیقی تنقیدی اور تاریخی کتابیں انجمن کی طرف سے شائع کی گئیں۔ اس سلسلے میں عورتوں اور مردوں دونوں نے کام۔ انجمن ترقی اردو کی باقاعدہ زنانہ شاخ بھی قائم کر دی گئی تھی جس میں اس دور کی تعلیم یافتہ خواتین نے بھی حصہ لیا۔(٥٦)

حواشی:

(۱)Britannica Concise Encyelopedia http://wwwbritannica.com/

۲۰۲۵_۰۷_۰۷

(۲)۔ انگریزی عبارت اس طرح ہے

"Feminism is the theory of political, economics and social equality of sexes"

Merrium-Webster Online Dictionary (۲۰۲۵)"

۲۰۲۵_۰۷_۰۸http://www.merrium.webster.com/dictonary/feminismRetrieved on

(۳)۔انگریزی عبارت اس طرح ہے

:"Feminism is both an intellectual commitment and a political movement thet seeks

justice for women and the end of sexism in all forms"Stanford Encyclopedia of

Philosophy http://plato.stanford.edu/cgi-bin/encyclopedia/orchinfo.cgiRetrieved on

۲۰۲۵_۰۷_۱۰

isthe belief in (۴)Collins Dictionary and Thesaurus, (۲۰۰۶), Collins, London'Feminism

the importance of gender equality.

concept." By Nancy (۵)invalidating the idea of gender hierarchy as a socially constructed

Yale University Press. p-۵_۴Cott (۱۹۸۷), The Grounding of Modern Feminism,

(۶)Cornell Durcilla (۱۹۹۸), At the Heart of Freedom; Feminism, Sex and Equality.

Princeton University Press, Princeton, NJ. P.۵

(۷)Walby, S. (۲۰۰۰), Feminist Theory, Rouledge, London p.۲۳۶

(۸)Weedon, C (۱۹۹۹), Feminism, Theory and the Politics of Difference. Blackwell, Oxford

p.۳۲

(۹)Nancy Cott (۱۹۸۷), The Grounding of Modern Feminism, Yale University press

(۱۰) Nancy Cott (۱۹۸۷), The Grounding of Modern Feminism, Yale University

(۱۱)۔ایضا

(۱۲)۔عورتوں کی محکومیت(۱۹۹۳)ترجمہ افتخار شیروانی مطبوعہ فیروز سنز-لاہور

(۱۳)Nancy Cott (۱۹۸۷) The Grounding of Modern Feminism Yale University Press

(۱۴)Davidoff (۱۹۸۶), Our Work, Our Lives, Our Words: Women's History, Women's

Work, MacMillan, London

(۱۵) Simone de Beauvoir, ۱۹۷۴ (۱۹۵۲), The Second Sex, Translated and edited by

Parshley. Vintage Books, New York

(۱۶)Elanie Showalter, (۱۹۸۸) Towards a Feminist Poetics: The New Feminist Criticism

Random House, New York

(۱۷) Betty Friedan, (۱۹۶۳) The Feminine Mystique, Norton, New York

(۱۸)۔ ایضاً

[۱۹] Elanie Showalter (۱۹۸۸), The New Feminist Criticism, Random House, New York

(۲۰)۔ایضا

(۲۱)۔ایضا

(۲۲)۔ایضا

(۲۳)۔ درگاہ پرشاد نادر نے تذکرۃ النساء نادری کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی۔ اس کتاب کا تاریخی نام مرات خیالی تھا۔ مرات خیالی کے دو حصے ہیں گلشن ناز اور چمن انداز گلشن ناز (۱۸۷۶ء) فارسی شاعرات کا تذکرہ ہے اور چمن انداز (۱۸۷۸ء) اردو شاعرات کا تذکرہ ہے، اس میں کل ۴۴ا شاعرات کا تذکرہ ہے۔

(۲۴)۔ ان تینوں تذکروں کے تفصیلی جائزے کے لئے دیکھیے اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ مطبوعہ لاہور (۱۹۷۲ء)

(۲۵)۔ سرسید احمد خان (۱۸۵۷ء) ۱۹۸۶ء، اسباب بغاوت ہند (فصل اول)، اردو اکیڈمی سندھ - ص ۱۲۵

(۲۶)۔ محمد امین زبیری (۱۹۵۶ء) مسلم خواتین کی تعلیم۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی ص، ۹۵، ۹۲

(۲۷)۔ مراۃ العروس (۱۸۷۰ء)

(۲۸)۔ بنات النعش (۱۸۷۲ء)۔ ان دونوں ناولوں میں نذیر احمد نے عورتوں کی باقاعدہ تعلیم کا تصور پیش کیا۔

(۲۹)۔ فسانہ آزاد (۱۸۸۰)۔ میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

(۳۰)۔ بدر النساء کی مصیبت (۱۹۰۱ء) شرر نے اس ناول میں عورتوں کی جہالت اور پردے کی سختی کے خلاف آواز بلند کی

(۳۱)۔ ۱۸۷۰ء میں حالی نے ایجو کیشنل کانفرنس میں نظم "چپ کی داد پڑھی۔ اس نظم میں مسلمان عورتوں کی تعلیمی حالت کا بڑی دردمندی سے ذکر کیا گیا تھا۔ عورتوں کی تعلیم اور ترقی میں اس نظم نے اس نوعیت کا کردار ادا کیا جو مسدس حالی نے قوم کی ترقی کے لئے کیا تھا۔ اس نظم نے ذہنوں کو جھنجوڑ ڈالا۔ یہ حد درجہ مقبول ہوئی اور لاتعداد مرتبہ شائع ہوئی۔ اپنے عہد میں یہ ایک نوع کی فیمنسٹ نظم ہی کہی جا سکتی ہے۔

(۳۲)۔ محمد امین زبیری (۱۹۵۶ء) مسلم خواتین کی تعلیم، ایجو کیشنل کانفرنس۔ کراچی

(۳۳)۔ ڈاکٹر یمیں شمر فضل (۱۹۹۱) ہندوستانی مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی، دہلی ص ۱۱۸

(۳۴)۔ نصیر احمد ہاشمی (۱۹۵۶ء) ۱۹۸۵ء۔ دکن میں اردو، ترقی اردو بیورو، دہلی ص ٦٦

(۳۵)۔ ڈاکٹر سیمیں شمر فضل (۱۹۹۱ء)، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ، دہلی میں، ص، ۱۱۹

(۳٦)۔ مولانا امداد صابری (۱۹۷۴ء)، تاریخ صحافت اردو (جلد ۵) دیلی۔ ص ۴۷۴

(۳۷)۔ رازق الخیری (۱۹٦۴ء) ماہنامہ عصمت کراچی (سالگرہ نمبر) جولائی اگست، ص ۱۴۱

(۳۸)۔ ڈاکٹر عصمت جمیل (۲۰۰۱ء)، اردو افسانہ اور عورت، شعبہ اردو زکریا یونیورسٹی، ملتان، ص ۹۲

(۳۹)The Emergence of Feminism Among Indian Muslim Women

(۱۹۲۰), Azra Asghar, London

(۴۰)۔ ایضا

(۴۱)۔ ایضا

(۴۲)۔ وقار عظیم (۱۹٦۸ء) صحیفہ لاہور۔ اپریل ۴۸ء

(۴۴)۔ قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے (حصہ اول)، لاہور۔ ص ۱۶۲

(۴۵)۔ ایضا

(۴۶)۔ رازق الخیری (۱۹۶۷ء) ماہنامہ عصمت، کراچی بابت دسمبر ۶۷ء

(۴۷)۔ ڈاکٹر نیام فرزانہ (۱۹۹۲ء) اردو کی اہم ناول نگار خواتین علیگڑھ

(۴۸)۔ نصیر الدین ہاشمی (۱۹۵۲ء) دکن میں اردو، لاہور، ۸۱۶

(۴۹)۔ ایضا

(۵۰)۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری (۱۹۸۲ء)، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔ ص ۱۴۲

(۵۱)۔ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین (۱۹۹۱) ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ مشمولہ خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، ص ۱۵۱-۱۵۹

(۵۲)۔ ایضا

(۵۳)۔ انیسہ بیگم شروانیہ (۱۹۵۴ء) حیات ز-خ ش۔ حیدر آباد دکن

(۵۴)۔ ایضا

(۵۵)۔ ایضا

(۵۶)۔ ایضا

باب دوم

امرتا پریتم (سوانح)

ابتدائی زندگی، ادبی زندگی معاصرین

امریتا پریتم ۳۱ اگست ۱۹۱۹ کو متحدہ ہندوستان کے شہر گوجرانولہ (جو کہ اب پاکستان کا شہر ہے) میں ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئیں ان کا پیدائشی نام امرت کور تھا۔(۱)

ان کا شمار ۲۰ ویں صدی کے پنجابی زبان کے اہم لکھاریوں میں کیا جاتا ہے۔

چھ دہائیوں میں پھیلے اپنے کیریئر کے دوران انہوں نے نظمیں، ناول، خودنوشت، نثر وغیرہ میں تقریباً ۱۰۰ سے زائد کتابیں لکھیں ان میں پنجابی لوک گیتوں کی ایک مجموعہ اور خودنوشت بھی شامل ہے ان کی کتابوں کے کئی بھارتی اور بدیسی زبانوں میں تراجم کیے گئے۔

ان کے والد خود بھی شاعر تھے، اسی وجہ سے ان کا رجحان بھی شاعری کی جانب ہوا، قافیہ بندی اور ردیفوں کی جانکاری کا بنیادی علم اپنے باپ سے ہی حاصل کیا۔ ان کی والدہ نے چار سال کی عمر میں ہی ان کی منگنی دور کے رشتے میں پھوپھی زاد کے ساتھ کر دی۔

جب امریتا گیارہ سال کی تھیں تو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا باپ نے سولہ سال کی عمر میں ان کی شادی کر دی ان کے شوہر کا نام پریتم سنگھ کوثر تھا یہ شادی ۱۹۳۶ میں ہوئی۔ شادی کے بعد وہ امریتا پریتم ہو گئیں، ان کے دو بچے بیٹا نوراج اور بیٹی کندلا ہیں۔(۲)

امریتا پریتم نے ۱۹۳۲ میں آٹھویں اور ودوانی کی تعلیم پاس کی، ۱۹۳۳ میں گیانی پاس کی انہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا ۱۵ مئی ۱۹۷۳ کو دلی یونی ورسٹی کی جانب سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی"۔(۳)

ان کا بچپن لاہور میں بیتا اور اعلیٰ تعلیم بھی یہیں حاصل کی انہوں نے چھوٹی عمر میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی شاعری کی پہلی کتاب ٹھنڈیاں کرناں (٤) جب منظر عام پر آئی اس وقت ان کی عمر سولہ برس تھی، سولہ برس کی عمر میں کسی لڑکی کی کتاب کا چھپنا ایک انوکھی بات تھی۔ پنجابی زبان کی پہلی عالمی شہرت یافتہ شاعرہ کے طور پر انہیں مانا جاتا ہے۔

انہیں ٦ ١۹٥ میں سنہیڑے شعری مجموعے پر ساہت اکادمی پرستار سے نوازا گیا، ١۹٥٨ میں بھاشاو بھاگ کی جانب سیساہت کا پریشر دلی کی جانب سے ١۹٧٤ میں انعام دیا گیا، ١۹٨٢ میں انہیں کاغذ کے کینوس شعری مجموعے پر بھارت کے سب سے بڑے ایوارڈ گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔(٥)

امریتا پریتم جب اٹھائیس برس کی تھیں تو انہوں نے ہندوستان کی تقسیم کو اپنی آنکھ سے دیکھا، اس وقت جو ہندو مسلم فسادات چل رہے تھے، عورتوں کو جبری اٹھایا جا رہا تھا اور بھی کئی واقعات کو ملا کر اپنے ایک اہم ناول پنجر میں قلمبند کیا۔ امریتا پریم کو لکھنے کا فن اپنے والد کے علاوہ کم عمری میں ہی رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی ملا وہ اپنی خود نوشت میں لکھتی ہیں:

"جب میں رابندر ناتھ ٹیگور سے ملی تو میں بہت تھوڑی نظمیں لکھا کرتی تھی لیکن انجان کی انہوں نے جب ایک نظم سنانے کے لئے کہا تو جھجکتے جھجکتے سنائی لیکن انہوں نے جو پیار اور توجہ

دی وہ نظم کے مطابق نہیں تھی بلکہ ان کی اپنی شخصیت کے تو مطابق تھی وہ تاثر مجھ پر بہت گہرا تھا"۔(۶)

کہتے ہیں شہرت کے ساتھ ساتھ مخالفت کے محاذ بھی کھل جاتے ہیں امریتا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اس کے کردار پر سوال اٹھائے گئے اور اس کی نظموں کو غیر اخلاقی کہا گیا۔

یہی وہ دور تھا جب پنجابی کے مشہور شاعر موہن سنگھ اور امریتا پریتیم کے تعلق کی باتیں ہونے لگیں، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ موہن سنگھ نے امریتا پر کی نظمیں لکھی تھیں اگر یہ محبت تھی بھی تو ایک طرفہ امریتا پریتم اپنی سوانح عمری رسیدی ٹکٹ میں لکھتی ہیں:

" آخر ایک روز میں نے صاف صاف موہن سنگھ کو بتا دیا، موہن سنگھ جی میں آپ کی دوست ہوں آپ کا احترام کرتی ہوں آپ اور کیا چاہتے ہیں؟ موہن سنگھ نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور بعد میں ایک مختلف نظم لکھی جس میں میرے الفاظ دہرائے گئے تھے میں آپ کی دوست ہوں، میں آپ کی دوست ہوں آپ اور کیا چاہتے ہیں؟ اور ساتھ ہی اگلی سطر میں اداسی بھرے لہجے میں لکھا میں اور کیا چاہتا ہوں؟(۷)

زندگی بھی عجیب تماشا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیسے کردار بدل جاتے ہیں امرتا کی زندگی میں بھی ایسا ہی ہوا ساحر سے اس کی محبت بھی کسی ادھورے اور نامکمل افسانے کی مانند رہی۔ یہ ایک شدت بھری محبت تھی بس اس کا بیان امرتا کی خودنوشت رسیدی ٹکٹ میں جابجا ملتا ہے یہ وہ زمانہ تھا جب ساحر کی شہرت ہر طرف تھی خاص کر اس کی نظم تاج محل نوجوانوں میں بہت مقبول رہی۔ امرتا کی قیمتی چیزوں میں یہ بھی تھی جو ساحر نے فریم کروا کر اسے دی

تھی اور لاہور سے جاتے ہوئے امرتا دوسری قیمتی چیزوں کے علاوہ اسے بھی اپنے ساتھ لے کر لاہور سے ہجرت کی

امرتا پریتم لکھتی ہیں:

"جب دلی میں پہلی ایشین رائٹر کانفرنس ہوئی تھی شاعروں اور ادیبوں کو ان کے ناموں کے ڈیلی گیٹ بیج دیئے گئے جو سب نے اپنے کوٹوں پر لگا رکھے تھے۔ ساحر نے اپنے کوٹ پر میرے نام والا بیج لگالیا تھا اس وقت کسی کی نظر پڑی اور اس نے کہا کہ ہم نے غلط بیج لگا رکھے ہیں۔ ساحر نے کہہ دیا تھا۔ بیج دینے والوں سے غلطی ہوئی ہوگی۔ لیکن اس غلطی کو ہم نے درست کرنا تھا نہ کیا برسوں بعد رات کو دو بجے خبر سنی کہ ساحر نہیں رہے تو لگا جیسے موت نے اپنا فیصلہ اس بیج کو پڑھ کر کیا جو میرے نام والا تھا اور ساحر کے کوٹ پر لگا ہوا تھا"۔(۸)

امرتا پریتم کا ساحر کے ساتھ معاشقہ ادبی دنیا کے سب سے بڑے معاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور ساحر کے ساتھ اس کا معاشقہ ہی امرتا اپنے شوہر کے ساتھ علیحدگی کا سبب بھی بنا۔

امرتا پریتم کہتی ہیں:

"میری اور ساحر کی دوستی میں کبھی بھی الفاظ حائل نہیں ہوئے یہ دو خاموش بستوں کا ایک حسین رشتی تھی میں نے اس کے لیے ہے جو نظمیں کہی تھیں اس مجموعہ کلام کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا پریس والے میری تصویر لینے لگے میں نے اس وقت محسوس کیا کہ میں کاغذ پر کچھ لکھ رہی ہوں۔ فوٹو گرافر جب تصویر لے کر چلے گئے تو کاغذ اٹھا کر دیکھا اس پر بار بار صرف ایک لفظ لکھا گیا تھا ساحر ساحر ساحر اپنی اس دیوانگی کے عالم پر بعد میں گھبراہٹ ہوئی کہ صبح جب اخبار میں تصویر چھپے اور تصویر والے کاغذ پر سے یہ نام بھی پڑھا جائے گا تو کیسی قیامت آئے گی؟ لیکن قیامت نہیں تصویر چھپی تو کاغذ بالکل کورا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد ازاں یہ حسرت رہی کہ خدایا یہ کاغذ جو خالی

دکھائی دے رہا تھا یہ خالی کاغذ نہیں تھا شاید ہی کورے کاغذ کا رشتہ تھا کہ آج سے کئی برس پہلے جب تلخیاں کا ایک ایڈیشن شائع ہو رہا تھا تو ساحر نے مجھے دیباچہ لکھنے کے کہا تھا مگر میرے احساسات میری طرح خاموش رہے نجانے یہ کورے کاغذ کی یہ کیسی ضد تھی میں تلخیاں کا دیباچہ نہیں لکھ پائی۔ کورے کاغذ کی آبرو آج بھی اسی طرح ہے میں نے اپنی سوانح عمری رسیدی ٹکٹ میں اپنے معاشقے کی داستان لکھی تھی ساحر نے پڑھی تھی لیکن اس کے بعد کسی بھی ملاقات میں رسیدی ٹکٹ کا ذکر نہ میری زبان پر آیا نہ ساحر کی زبان پر۔(۹)

مجھے یاد ہے کہ

"ایک مشاعرے میں کچھ لوگ ساحر کے آٹو گراف لے رہے تھے جب چلے گئے اور میں نے اکیلی اس کے پاس کھڑی رہ گئی تو ہنستے ہوئے میں نے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے بڑھادی۔ کورے کاغذ کی طرح اور اس نے میری ہتھیلی پر اپنا نام لکھ دیا اور کہا یہ بلیک چیک پر میرے دستخط ہیں جو تم چاہو اور جب چاہو کیش کروالینا۔ چاہے وہ کاغذ ماس کی ہتھیلی تھی لیکن اس نے کورے کاغذ کا نصیب پایا تھا اس لیے کوئی حرف اس پر نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ حرف تو آج بھی میرے پاس نہیں ہیں یہ محض کورے کاغذ کی داستان ہے اس داستان کی ابتدا بھی خاموش تھی اور ساری اس کی انتہا بھی خاموش رہی"(۱۰)

امرتا کا ساحر کے نام آخری خط

میرے محبوب ویسے تو جب بھی کوئی نغمہ لکھنے لگتی ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے میں تم کو خط لکھ رہی ہوں اور لوک گیتوں کی گوری کبھی کوؤں کو قاصد بناتی ہے اور کبھی کبوتروں کے پیروں میں پیغام لپیٹ دیتی ہے۔ پرانے وقت اب گزر گئے۔ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جو کسی چٹھی رساں کے قدموں کے سراغ لیتے ہیں مگر جب کسی کو خط

ڈالنا ممکن نہ ہو تو اس وقت صرف ہوائیں ہی رہ جاتی ہیں جن کے پلو میں کوئی پیغام باندھ لیں۔ مجھے یاد ہے جب میں نے پہلے تمہیں لکھا تھا ایک بیگانہ گاؤں تھا اور میں سوچنے لگی تھی کہ گاؤں بیگانہ ہے مگر تم کیوں بیگانہ نہیں۔

ایک دن میرے گھر کی دہلیز کو تمھارے قدموں نے چھوا میں نے تمھاری آواز سنی تو مجھے محسوس ہوا جس ہوا میں تمھاری سانس ملی ہے اس میں ایک مہک آنے لگی ہے۔ ایک دن تم آئے تمھارے ہاتھ میں کاغذ تھا میں نے کہا پڑھ کر سناؤ گے؟ تم نے اپنا نغمہ پڑھ کر گایا مجھے محسوس ہوا کہ تمھاری آواز جیسی میں نے کبھی نہیں سنی تمھارے نغمہ جیسا نغمہ میں نے کبھی نہیں سنا۔ امرتا پریتیم اور ساحر کی محبت گو اپنی منزل کو نہ پا سکی تاہم اس میں جو بے اختیاری اور شدت تھی وہ کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ امرتا پریتم لکھتی ہیں:

> "اخباروں اور کتابوں میں کئی حادثے پڑھے تھے کہ ایک دن سونے والی ماں کے کمرے میں جس طرح کی تصویریں رکھی ہوں یا جس قسم کی صورت وہ دل میں لائے بچے کے خدوخال ویسے ہی بن جاتے ہیں۔ میرے تخیل نے جیسے دنیا سے چھپ کر دبے لہجے میں میرے کانوں میں کہا اگر میں ساحر کا چہرہ ہر وقت اپنی یادوں کے سامنے رکھوں تو میرے بچے کی صورت اس کے مشابہ ہو جائے گی۔
>
> جو زندگی میں نہیں پایا تھا جانتی ہوں یہ اس کو پا لینے کی سعی تھی خدا کی طرح پیدائش دینے کی سعی۔ خیر دیوانگی کی آخری چوٹی پر پاؤں رکھ کر ہمیشہ کھڑے نہیں رہا جا سکتا پاؤں کو بیٹھنے کے لیے زمین کا قطعہ چاہیے اسی لیے آئندہ کروں میں اس کا تذکرہ ایک پری کہانی کی طرح کرنے لگ گئی ایک بار یہ بات میں نے ساحر سے کو بھی سنائی اپنے آپ پر ہنستے ہوئے اور اس کے ردعمل کی خبر نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ سن کر ہنس پڑا اور صرف اس نے اتنا کہا!

ساحر کو زندگی کا سب سے بڑا ایک کمپلیکس ہے کہ وہ خوبرو نہیں اس لیے اس Very Poor taste نے میرے پور ٹیسٹ کی بات کہی۔ اس سے بیشتر بھی ایک بات واقعہ ہوئی تھی۔

ایک روز میری بچی کو گود میں بٹھا کر اس نے کہا تھا تم کو ایک کہانی سناؤں؟ اور جب میری بچی کہانی سننے کے لیے تیار ہوئی تو وہ سنانے لگا ایک تھا لکڑ ہارا وہ شب روز جنگل میں لکڑیاں چیر تا تھا۔ پھر ایک روز اس نے جنگل میں ایک شہزادی کو دیکھا۔ بڑی حسین لکڑ ہارا کا جی چاہا وہ شہزادی کو لے کر بھاگ جائے، پھر؟ میری بیٹی کی کہانی میں ہوں، کرنے کی عمر تھی۔ اس لیے بڑی توجہ سے کہانی سن رہی تھی۔ میں صرف ہنس رہی تھی۔ کہانی میں دخل نہیں دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔ لیکن تھا تو لکڑ ہارا نا، وہ شہزادی کی طرف دیکھتا رہا، دور فاصلے پر کھڑا ہو کر اور پھر اداس ہو کر لکڑیاں کاٹنے لگ پڑا۔ سچی کہانی ہے نا؟

ہاں میں نے بھی دیکھا تھا۔ معلوم نہیں بچی نے یہ کیوں کہا۔ ساحر ہنستا ہوا میری طرف دیکھنے لگا۔ دیکھ لو اس کو بھی معلوم ہے۔ اور بچی کو پوچھنے لگا تم وہاں ہی تھیں نا جنگل میں؟

بچی نے ہاں میں سر ہلایا۔

ساحر نے پھر اس کو گود میں بیٹھی ہوئی کو پوچھا۔۔ تم نے اس لکڑ ہارا کو بھی دیکھا تھا نا بھلا وہ کون تھا؟ بچی کو اس لمحے کوئی الہام اتر تا لگتا تھا کہنے لگی آپ۔ ساحر نے پھر پوچھا اور پھر وہ شہزادی کون تھی۔ ماما، بچی ہنسنے لگی۔ ساحر مجھ سے کہنے لگا۔۔ بچوں کو سب معلوم ہوتا ہے۔

پھر برسوں بیت گئے۔ ۱۹۶۰ء میں جب بمبئی گئی تو ان دنوں راجندر سنگھ بیدی بڑے مہربان دوست تھے۔ اکثر ملا کرتے تھے۔ ایک شام بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک انہوں نے پوچھا پر کاش پنڈت

سے ایک بات سنی تھی کی نوراج ساحر کا بیٹا ہے۔ اس شام میں نے بیدی صاحب کو اس عالم دیوانگی کی بات سنائی۔۔۔ کہا۔۔۔ یہ تخیل کا سچ ہے۔ حقیقت کا سچ نہیں۔(۱۱)

انہی دنوں میں ایک روز نوراج نے بھی سوال کیا اس کی عمر قریب قریب تیرہ سال تھی۔۔۔ ماما۔۔

ایک بات پوچھوں سچ سچ بتادو گی؟ ہاں!

کیا میں ساحر انکل کا بیٹا ہوں؟

نہیں!

لیکن اگر ہوں تو بتادیجیے! مجھے ساحر انکل اچھے لگتے ہیں۔

ہاں، بیٹے مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سچ ہوتا تو میں ضرور بتادیتی۔

سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ میرے بچے کو یقین آگیا۔

سوچتی ہوں۔۔ تخیل کا سچ جھوٹا نہیں تھا۔ تاہم وہ صرف میرے لیے تھا۔ صرف میرے لیے۔ اس قدر کہ وہ سچ ساحر کے لیے بھی نہیں۔

پریتیم سنگھ سے علیحدگی نے ان کے بچوں کی زندگیوں پر کیا اثرات مرتب کیے اس کا ذکر بھی انہوں نے اپنے ایک ناول میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

یہ ایک خط تھا جو میرے بیٹے نے مجھے ہاسٹل سے تحریر کیا تھا۔ ناول میں خط پانچویں باب کے آغاز میں ہے۔ نوراج جب چھٹیوں میں ہاسٹل سے گھر آتا تو ہاسٹل کی کئی باتیں بہ تفصیل سنایا کرتا تھا۔ اس خط کے بعد جب آیا تو میں نے ناول شروع کرنے سے پیشتر اس کو پاس بٹھا کر نوٹس لینے شروع کیے پھر جب ناول شروع کیا تو ایک بار اس نے کہا ماما آپ نے اپنی زندگی کو موڑ دیا لیکن سب کو معلوم ہے ہم

دونوں بچوں نے اس کے لیے کتنی ذہنی اذیت برداشت کی ہے؟" گھر ٹوٹتا ہے تو معصوم بچے ٹوٹتے ہوئے گھر کے کنکر کس طرح بدن پر برداشت کرتے ہیں، اس کا درد میرے دل میں تھا۔ کہا۔۔ جس طرح غریب گھر پیدا ہوئے بچوں کو ماں کی غریبی بھگتنا پڑتی ہے، اسی طرح دل کے درد وسوز میں سے گذرتی ہوں ماں کے گھر پیدا ہوئے بچوں کو اس سوز و گداز کو بھی بھگتنا پڑتا ہے.....ماں کے خدوخال کی طرح۔۔۔ جانتی ہوں، اس سوز و گداز کو میرے بچوں نے بھی جھیلا ہے۔ لیکن میری بیٹی نے سارے عرصے کی طوالت میں کبھی بھی میرے ساتھ ہمدردی نہیں گنوائی تھی لیکن بیٹے نے کچھ عرصے کے لیے ضرور گنوائی تھی۔ بچپن سے شباب میں قدم رکھنے کے درمیانی وقفہ میں! یہ شاید ایک ایک لڑکا اور لڑکی ہونے کا فرق تھا۔

آج بھی میری ننھی سی انجان کی بیٹی کے وہ بول میرے کانوں میں ہیں، جب نوراج کی کسی کسی وقت کی بے رخی سے اداس ہو جاتی تو کندلا کہا کرتی تھی۔۔۔ "ماما! آپ زیادہ غور و فکر نہ کیا کریں۔ سیلی بڑا ہو جائے گا تو آپ سے آپ ٹھیک ہو جائے گا!۔ امریتا پریتم اپنے بچوں کی شادی کے حوالے سے بیان کرتی ہیں۔(۱۲)

دورو کہ کندلا نے جس کے ساتھ شادی کی وہ مجھے دیدی ماں پکارتا تھا اور اس کے دل کا فیصلہ تھا کہ شادی کے موقع پر وہ دورونزدیک کے لوگوں کی بارات نہیں باندھے گا اور نہ کسی بے تکی کے لئے کسی کو موقع دے گا، شادی کی پیشکش کے وقت اس کا پیارا سا جیسچر مجھے ابھی بھی یاد ہے میرے سرہانے کے پاس ایک ہومیوپیتھی دوائی کی شیشی رکھی تھی اس نے اس کی دو چار میٹھی سی گولیاں نکال کر کھاتے ہوئے کہا بس! منہ میٹھا ہو گیا شگن ہو گیا اور اس طرح اس نے اپنے اور میرے دل کی ہاں کا جشن منالیا، شادی کا دن کندلا کی روز پیدائش منتخب کیا، ۲۳ اپریل اور اس کے کیک پر لکھا "اے ڈیٹ ود، لائف" اور عدالت میں جانے کے بجائے مجسٹریٹ کو گھر بلا کر شادی کا سرٹیفکیٹ لے لیا۔

نوراج نے ایک گجراتی دوشیزہ کے ساتھ شادی کی ہے۔ یونیورٹی سے وہ آرکیٹیکچر کی ڈگری اور اپنی لہن دونوں چیزیں گویا اکھٹی لایا تھا، میرے بیٹے کے یہ الفاظ تھے۔ ماما اگر یہ لڑکی میری زندگی سے چلی گئی تو ساری زندگی میرے دل میں اس کی یاد رہ جائے گی" سوچتی ہوں اس کی یہ محبت بھی ایک حادثہ ہے جو زندگی کی الجھنوں کو سمجھنے میں مددگار ہوا ہے اور اس کے نقطہ نظر کو بڑا وسیع کر گیا ہے (۱۳)۔"

قیام پاکستان کے بعد جب امریتا پریتم دلی میں جاکر آباد ہو گئیں اور کچھ عرصے بعد ساحر لدھیانوی بھی دلی چلے آئے تو یوں پرانی محبت تازہ دم ہو گئی لیکن کچھ عرصے کے بعد ساحر بمبئی چلے گئے۔

بقول حمید اختر فلمی نغمے ساحر کی سب سے بڑی آرزو تھی امریتا اپنی جذباتیت میں یہی چاہتی تھیں کہ ساحر دلی میں رہیں ان کے سامنے رہیں لیکن ساحر کا فیصلہ درست تھا یعنی ہم نے یہ مانا دلی میں رہیں کھائیں گے کیا۔

امریتا پریتم نے اس کی اظہار خود ایک اور طریقہ سے کیا ہے جب مصور اندرجیت امروز ان کی زندگی میں آئے اور کچھ عرصے بعد انہیں ممبئی میں فلموں کے آرٹ ڈائریکٹر کی پیشکش ہوئی تو وہ بھی بہتر مستقبل کے لئے ممبئی چلے گئے تب امریتا نے کرب سے لکھا۔

"ایک پہلے مجھے چھوڑ کر بمبئی چلا گیا اور دوسرا بھی اچھے کل کے لئے میرا آج ویران کر گیا ہے ۔۔۔امروز واپس آگئے اور دونوں نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا اب اس کی زندگی میں نہ ساحر تھے نہ سجاد حیدر اور نہ دیوندر امریتا پریتم اب امروز کی چھتری تلے آگ تھیں یہ عجیب طرح کا سمبندھ سنجوگ تھا۔۔۔نہ پھیرے لئے نہ بیاہ کی باقاعدہ رسم۔۔ لیکن عمر بھر اکھٹے رہے، برادری امرتا پریتم

کے اس عمل پر کافی ناراض تھی اور ایک طرح سے ان کا سماجی بائیکاٹ کر رکھا تھا امریتا کا بیٹا نوراج بھی اس غیر سماجی اور غیر مذہبی رشتے کو قبول نہیں کرتا تھا"۔(۱٤)

امروز کے ساتھ اپنی زندگی کے مختلف ادوار کا ذکر کرتے ہوئے امرتا پریتم نے ان تمام نشیب و فراز کا تذکرہ کیا ہے جو زندگی کے اس طویل سفر میں قدم بہ قدم لمحہ بہ لمحہ پیش آئے۔ لکھتی ہیں:

"ایک دن کسی گھر آئے مہمان نے میرا اور امروز کا ہاتھ دیکھا مجھے کہنے لگا تمھارے ہاتھ میں دولت کی بڑی لمبی اور گہری لکیر ہے تمھیں زندگی میں کبھی دولت کی کمی نہیں آسکتی لیکن امروز سے کہنے لگا تمھارے پاس دولت کبھی نہیں ٹھہرے گی تمھارے ہاتھ کی لکیر جگہ جگہ ٹوٹتی ہیں؟امروز نے اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ پکڑ کر کہا اچھا پھر ہم دونوں ایک ہی لکیر سے گزارہ کرلیں گے۔جب کوئی کسی کا حال اپناتا ہے، اصل میں اپنے پن میں اس کا اور دوسرے کا ماضی بھی شامل ہو جاتا ہے ایک کا الگ اور دوسرے کا الگ نہیں رہ جاتا گو وہ آنکھوں سے دیکھا نہیں ہوتا لیکن وہ بھی اپنے وجود کا حصہ بن جاتا ہے اپنے جسم کے کسی پرانے زخم کی مانند امروز کو معلوم ہے میں نے ساحر سے محبت کی تھی یہ معلوم ہونا اپنے آپ میں اہم بات نہیں ہے اس سے پرے جو کچھ بہت اہم ہے اور بڑا ہے وہ امروز کا میری ناکامی کو اپنی ناکامی سمجھ لینا ہے۔امروز جب ساحر کی کتاب آؤ کہ کوئی خواب بنیں کا ٹائٹل صفحہ بنا رہا تھا تو ہاتھ میں کاغذ تھامے کمرے سے باہر آ گیا بیرونی کمرے میں ،میرے اور دیو بندر سے کہیں زیادہ امروز نے ماضی کے عمل میں اتر کر کہا۔۔۔۔۔سالا خواب بننے کی بات کرتا ہے بنے کی نہیں میں ہنس پڑی۔۔۔سالا جو ساری عمر خواب ہی بنتا رہا کسی کے خواب نہ بنامیں دیو بندر ،امروز کتنی دیر ہنستے رہے سمیت اس درد کے جو اس قسم کے موقع پر اس قسم کی ہنسی میں شامل ہوتا ہے کبھی حیران ہو جاتی ہوں امروز نے مجھے کس طرح کا اپنایا ہے بمعہ اس سوز کے کو اس کی مسرتوں کا مخالف ہے ایک بار ہنس کر کہا تھا" ایمو اگر تجھے ساحر مل جاتا پھر تم نے نہیں ملنا تھا۔۔۔اور وہ مجھے مجھ سے بھی آگے اپنا کر

کہنے لگا۔۔۔میں نے تو ضرور ملنا تھا، چاہے تمھیں ساحر کے گھر نماز پڑھتی کو جا ڈھونڈ تا سوچتی ہوں کی کوئی خدا اس قسم کے انسان سے کہیں الگ ہوتا ہے؟ امروز اگر یہ نہ ہوتا جو ہے تو میں اس کے منہ کی طرف دیکھ کر یہ شعر کبھی نہیں لکھ سکتی تھی۔

پاپ، بھائی، دوست اور خاوند کسی لفظ کا کوئی نہیں رشتہ، یوں جب میں نے تم کو دیکھا سارے حرف نمایاں ہو گئے۔(۱۵)

لکھ ایک اور مقام پر امرتا پریتم لکھتی ہیں:

"یہ دلوں کی عمر کس حساب سے بڑھتی گھٹتی ہے کسی کو بتلا سکنے کی گرفت میں نہیں امروز بھی کئی بار میرے ۵۲ برس کہا ۲,۵ سے ادھر کر کے اس کو ۲۵ بن کیا کرتا تھا اور اپنے ۴۶ برس کے ہندسوں کو الٹا کر کے ۶۴ برس کا بن جایا کرتا تھا امروز مجھ سے ساڑھے چھے سال چھوٹا ہے مجھ سے دھوپ اور بارش اب برداشت نہیں ہوتے لیکن اس کو یہ کوئی فرق نہیں ڈالتے کئی بار ہنس کر کہتی ہوں خدا ایک جوانی تو سب کو دیتا ہے لیکن مجھ کو اس نے دو دی ہیں میری ختم ہو گئی تو دوسری اس نے مجھے امروز کی صورت میں دی"۔(۱۶)

امرتا پریتم کو ادبی حلقوں میں ہدف تنقید بنایا جاتا رہتا تھا وہ اپنی سوانح میں لکھتی ہیں:

"پنجابی کا کوئی رسالہ یا اخبار ایسا نہ تھا جس کو کھولتے وقت مجھے یہ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ اس میں کس نے کیا میرے خلاف اگلا ہو گا۔۔۔کئی جو مجھ سے پہلے امروز کے ہاتھ لگ جاتے تھے وہ مجھ سے چھپا کر ان کو پھاڑ ڈالتا تھا، اس کا کچھ ذکر میرے ناول دلی کی گلیاں میں آیا تھا اس میں امروز ناصر کی صورت میں تھا اور میری موت کے بعد انہی اخباروں کے ماتم، ایک بہت بڑا دروغ ہوں گے اور میں سمجھتی ہوں کسی کی لاش کے پاس اگر کوئی گل و برگ نہیں رکھ سکتا تو اس کو دروغ ایسی شے رکھنے کی بھی کوئی حق نہیں

۔امروز نے حتی الوسع زندگی میں بھی ان جھوٹوں سے بچایا تھا اس کو کہہ سکتی ہوں کہ وہ کسی جھوٹ کو میری لاش کے قریب پھٹکنے نہ دے، میری مٹی کو صرف میرے بچوں اور امروز کے ہاتھ کافی ہیں صرف کافی نہیں غنیمت ہیں"۔(۱۷)

"زندگی امروز کے ساتھ ہموار شے نہیں یہ بے شمار بلندیوں اور پستیوں سے بھری ہوئی ہے اس میں دو خوبیاں ملتی ہیں اور ٹکراتی ہیں دریاؤں کے پانیوں کی طرح ملتی اور دو چٹانوں کی طرح ٹکراتی ہیں لیکن چودہ برس کے (رام بن باس جتنے برسوں کے) تجربے کے بعد کہہ سکتی ہوں کہ اس راستے کی پستیاں چھوٹا سچ ہیں اور اس راستے کی بلندیاں بڑا سچ ہیں۔امروز کی شخصیت دریا کی روانی ایسی ہے جس طرح دریا ایک حد قبول کرتا ہے لیکن نہر ایسی پختہ اور ٹھوس حد نہیں،وہ چاہے تو اپنے بہنے کا رخ بدل بھی سکتا ہے۔امروز کے لئے کوئی رشتہ اس وقت تک رشتہ ہے جب تک وہ بندش نہیں،رشتے اکثر اپنے طبعی آزاد روپ میں نہیں ہوتے کبھی ان کی تکمیل قانون نے تھامی ہوتی ہے اور کبھی سماجی فرائض نے لیکن امروز کے لفظوں میں" اگر راہ اپنی ہے تو راہداری کی کیا حاجت؟ ہر قانون راہداری ہوتا ہے امروز کو راہداری اپنی راہ کی توہین محسوس ہوتی ہے۔اور جہاں تک اس کی دوستی کے راستے میں آنے والی پستیوں کا سوال ہے اور ان کی وجوہ بالکل حقیر ہوتی ہے لیکن اس سے پیدا ہوا اس کا غصہ اور میری اداسی قریب تین گھنٹوں کے عرصے کے لیے بڑے گہرے ہو جاتے ہیں،اسقدر عمیق کہ تنہائی آخری سب معلوم ہونے لگتی ہے یہ وجوہ ہوتی ہیں ڈرائنگ روم کی گدی الٹی کیوں پڑی ہوئی ہے؟ سگریٹ کا خالی پیکٹ دیوان پر کیوں گرا پڑا ہے؟ گوند کی بوتل کو جس میز سے اٹھایا اس کے بجائے دوسری میز پر کیوں رکھ دیا؟ اگر کار باہر نکلی تو گیراج کا شٹر کیوں نہیں بند کیا؟ اور نوبت یہ آجاتی ہے،ہاتھ کا لقمہ ہاتھ میں اور سامنے پلیٹ میں رکھی ہوئی چپاتی پلیٹ میں پڑی رہ جاتی ہے گھڑی کی سوئی ایک مقام پر اڑ جاتی ہے،ایک خاموشی چھا جاتی ہے،جس میں صرف ایک ہی کھڑاک بہت اونچا بہت بار سنائی دیتا ہے

۔۔۔۔۔ کہ اس کے کمرے کا دروازہ دھم سے بند ہو جاتا ہے۔ قریب تین گھنٹے اسی طرح گزرتے ہیں

جیسے وقت کا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا ہو اور نیچے کا سانس نیچے، پھر امروز کے ایک حسین ترجملے کے

ساتھ یہ سکوت ٹوٹتا ہے "میں تیرا سیس آسن تو میرا پرانا نام"۔(۱۸)

کا پہلا انہیں ۱۹۵۶ میں سنیہڑے، شعری مجموعہ پر 'ساہت اکادمی پر سکار سے نوازا گیا۔ ۱۹۵۸ میں

بھاشاو بھاگ کی جانب سے ساہت کا پریشر دلی کی جانب سے ۱۹۷٤ میں انعام دیا گیا۔

۱۹۸۲ میں انہیں کاغذ تے کینوس، شعری مجموعے پر بھارت کے سب سے بڑا ایوارڈ گیان پیٹھ ایوارڈ حاصل ہوا۔

۳۱ اکتوبر ۲۰۰۵ کو ۸٦ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا"۔(۱۹)

ان کی تخلیقات

ناول

، ۱۔بجے سری(۱۹٤٦)۔ ۲.ڈاکٹر دیؤ(۱۹٤۹)،(اردو، ہندی، گجراتی، ملیالم انگریزی میں ترجمہ ہوا

۔ ۳۔ پنجر (۱۹۵۰)، (ہندی، اردو، گجراتی، ملیالم، مراٹھی، کونکنی، انگریزی، فرانسیسی سربو کروشیائی ترجمہ) ٤.

آہلنا(۱۹۵۲)، (ہندی، اردو اور انگریزی میں ترجمہ)۔ ۵۔اشو(۱۹۵۸)، (ہندی اور اردو میں ترجمہ)۔ ٦۔اک

سوال (۱۹۵۹)، (ہندی اور اردو میں ترجمہ) ۷۔ بلاوہ (۱۹٦۰)، (ہندی، اردو میں ترجمہ) - ۸۔ بند دروازہ

(۱۹٦۱)، (ہندی، کنڑ، سندھی، مراٹھی اور اردو میں ترجمہ) ورنگ را پتہ (۱۹٦۳)، (ہندی، اردو میں ترجمہ)۔

۱۰۔ اک سی انیتا (۱۹٦٤) (ہندی، انگریزی، اردو میں ترجمہ)۔ ۱۱۔ چک نمبر چھتی (۱۹٦٤)، (ہندی،

انگریزی، سندھی، اردو میں ترجمہ)۔ ۱۲۔ دھرتی ساگر تے سپیاں(۱۹٦۵)، (ہندی، اردو میں ترجمہ)۔ ۱۳ دلی

دیاں گلیاں (۱۹٦۸)، (ہندی میں ترجمہ) -۱٤. ڈھپ دی کاتر (۱۹٦۹)۔ ۱۵۔ اکیتے اور کل (۱۹٦۹)،

(ہندی، انگریزی میں ترجمہ (۱۹۷۱۔ ۱٦ جلاوطن (۱۹۷۰)، (ہندی، انگریزی میں ترجمہ)۔ ۱۷ یاتری

(ہندی)، کنڑ، انگریزی، بنگلہ اور سر بو کروٹ میں ترجمہ)۔ ۱۸ جیب ترے (۱۹۷۱) (ہندی، اردو، انگریزی،

ملیالم اور کنڑ میں ترجمہ)۔ ۱۹ کی حویلی (۱۹۷۲)، (ہندی میں ترجمہ)۔ ۲۰ اگ دی لکیر (۱۹۷٤)، (ہندی میں

ترجمہ)۔ ۲۱ کچی سڑک (۱۹۷۵)، (ہندی میں ترجمہ)- ۲۲ کوئی نہیں جان را (۱۹۷۵)، (ہندی، انگریزی میں

ترجمہ ۲۳ ایہہ سچ ہے (۱۹۷۷) (ہندی، بلگارئن اور انگریزی میں ترجمہ)۔ ۲٤ دوسری منزل (۱۹۷۷)، (ہندی

اور انگریزی میں ترجمہ)- ۲۵ تیہرواں سورج (۱۹۷۸)، (ہندی، اردو اور انگریزی میں ترجمہ)۔ ۲٦ انجا دن

(۱۹۷۹)، (ہندی اور انگریزی میں ترجمہ)۔ ۲۷ کورے کاغذ (۱۹۸۲)، (ہندی میں ترجم)۔ ۲۸ ہر دت دا

زندگی ناما (۱۹۸۲)، (ہندی اور انگریزی میں ترجمہ خود نوشت رسیدی ٹکٹ (۱۹۷٦) کہانی مجموعے ۱ چھتی

ورھے بعد (۱۹٤۳) ۲ کنجیاں (۱۹٤٤) ۳. آخری خط (۱۹۵٦)۔ ٤ گوجر دیاں پریاں (۱۹٦۰) ۵ چانن را

ہو گا (۱۹٦۲)۔ ٦ جنگلی ہوئی (۱۹٦۹) - ۷ ہیرے دی کنی۔ ۸. لاتییاں دی چھوکری وپنج ورھے لی سڑک۔ ۱۰

اک شہر دی موت ۱۱ تیجی عورت تمام مجموعوں کا ہندی میں ترجمہ ہوا۔ شعری مجموعے ۱ ٹھنڈھیاں کرناں

(۱۹۳٤) ۲ امرت لہراں (۱۹۳٦)۔ ۳ جیوندا جیون ۱۹۳۸)، ٤ تریل دھوتے پھل (۱۹٤۱)۔ ۵. او

گیتاں والیو (۱۹٤۲)-٦. بدلاں (دے پلے وچ (۱۹٤۳)۔ ۷۔ سنجھ دی لالی (۱۹٤۳)-۸ گھی جھی سوغات

(۱۹٤٤)۔ لوک پیڑ (۱۹٤٤)-۱۰. پتھر گیٹے (۱۹٤٦)-۱۱. لمیاں واٹاں، (۱۹٤۹)۔ ۱۲. میں

تواریخ ہاں ہند دی (۱۹۵۰)۔ ۱۳. سرگھی ویلا، (۱۹۵۱) ۱٤ میری چونویں کوریا (۱۹۵۲)-۱۵) نیزے

(۱۹۵۵-ساہت اکادمی انعام یافتہ)۔)۱۹٦٤ (۱۵ تک گئی (۱۹۵۷) -۱۷- کستوری (۱۹۵۹) -۱۸-

ناگ منی چھ زمیں (۱۹۶۹-۲۰ میں جمع توں (۱۹۷۷) - ۲۱- لامیاں وطن ۲۲ باندتے کینوس (گیان پیٹھ انعام یافتہ سری مجموعے کرچی لکیراں - ۲ کالا گلاب ۳ اگ دیاں لکیراں (۱۹۶۹)۔ ٤. اکی پتیاں ۱۰ گلاب، سفرنامہ (۱۹۷۳) ۵ عورت اک درشٹی کون (۱۹۷۵)۔ ٦ اک اداس کتاب (۱۹۷٦) - ۷ اپنے اپنے چار ورے (۱۹۷۸)۔ ۸ کیپری زندگی کیبڑا ساہت (۱۹۷۹) وکچے اکھر (۱۹۷۹)۔ ۱۰ اک ہتھ مہندی اک ہتھ چھلا ۱۹۸۰) ۱۱. محبت نامہ (۱۹۸۰) ۱۲. میرے کال کمٹ سمکالی (۱۹۸۰)۔ (۱۳ شوق صراحی (۱۹۸۱) - ۱٤. کڑی دھپ داسفر (۱۹۸۲) ۱۵. اج دے کافر (۱۹۸۲) تمام نثری کتب کا ہندی ترجمہ ہوا۔ سفر نامہ ۱ باریاں جھروکھے (۱۹٦۱) رسالہ "ناگ منی "ادارت: ۱۹٦٦ سے ۲۰۰۰ تک۔ امرتا پریتم کو ان کی ادبی خدمات کے عوض بھارت سرکار کی جانب سے مختلف ممالک کی ادبی کانفرنسوں میں بھیجا جاتا رہا وہ اپنی سوانح میں مختلف ممالک کے دوروں کا احوال بین کرتی ہیں ذیل میں مختصراًان کا ذکر کیا جاتا ہے ۱۹٦۰ میں ماسکو کی رائٹرز یونین کی جانب سے انہیں ماسکو بلایا گیا، اپریل ۱۹٦۱ میں وہ ادبی دورے پر تاشقند، تاجکستان، ماسکو اور آذربائجان گئیں، ۱۹٦٦ میں انہیں بلغاریہ سے دعوت نامہ موصول ہوا اسی سال کے آخر میں جارجیا کے شاعر شوتا ورستاولی کے آٹھ سو سالہ جشن میں انہیں مدعو کیا گیا۔ ۱۹٦٦ میں بھارت سرکار کی جانب سے ثقافتی تبادلے میں انہیں یوگوسلاویہ، ہنگری اور رومانیہ بھیجا گیا وہاں سے واپسی پر مغربی جرمنی نے انہیں اپنے خرچ پر اپنے دیس بلا لیا ، ۱۹٦۹ میں نیپال میں انڈین ایمبیسی کی دعوت پر نیپال گئیں۔ امرتا پریتم کی ادبی خدمات کے حوالے سے انہیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا جن میں سے چند ایک قابل ذکر ہیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۵٦ (پنجابی شاعری کے مجموعے سنہیڑے پر ملا) جان پیٹھ ایوارڈ (۱۹۸۲ یہ بھارت کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ہے، امرتا پریتم یہ ایوارڈ حاصل کرنے والی پہلی پنجابی ادیبہ تھیں) ۱۹٦۹ میں انہیں پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا ۱۹۸۱ میں انہیں

بھارتیہ جنتا ایوارڈ دیا گیا ۲۰۰۰ میں انہیں بھارت سرکار کی جانب سے صدر سالہ ایوارڈ دیا گیا ۲۰۰۴ میں انہیں پدم ایوارڈ سے نوازا گیا اس کے علاوہ ان کے مقبول زمانہ ناول پنجر جو انہوں نے ۱۹۵۰ میں لکھا ۲۰۰۳ میں اس پر ایک فلم بنائی گئی اور اس فلم کو بھی اس کی بے پناہ مقبولیت کے باعث ایوارڈ سے نوازا گیا"۔(۲۰)

حواشی:

(۱)۔امرتا پریتم کی شاعری،تراجم،فہمیدہ ریاض،نگارشات پبلیشرز،سن اشاعت،۲۰۱۹،ص،۹

(۲)۔ایضا،ص،۱۲

(۳)۔ایضا،ص،۱۲

(٤)۔ایضا،ص،۹

(٥)۔امرتالوک،ناشر،پینگوئین بکس انڈیا،سن اشاعت،۲۰۰٦،ص،۷۰

(٦)۔ایضا،ص،۷۱

(۷)۔ایضا،ص،۷٥

(۸)۔کلیاتِ ساحر،ساحر لدھیانوی،سن اشاعت،۱۹۹۸،حسامی بک ڈیپوٹ،حیدر آباد،ص،۸

(۹)۔ایضا،ص،۹

(۱۰)۔ایضا،ص،۹

(۱۱)۔رسیدی ٹکٹ،امرتا پریتم،علم و عرفان پبلیشرز،جون ۲۰۰۷،ص،۱۱۷،۱۱۸

(۱۲)۔ایضا،ص،۱۱۹

(۱۳)۔ایضا،ص،۱۱٥،۱۱٤

(۱٤)۔امرتا پریتم کی شاعری،تراجم،فہمیدہ ریاض،نگارشات پبلیشرز،سن اشاعت،۲۰۱۹،ص،۱۸،۱۷

(۱٥)۔رسیدی ٹکٹ،امرتا پریتم،علم و عرفان پبلیشرز،جون ۲۰۰۷،ص،۸٤،۸۳

(۱٦)۔ایضا،

(۱۷)۔ایضا،ص،۱۳٦

(۱۸)۔ایضاص،۱۳۷،۱۳۸

(۱۹)۔ایضا

(۲۰)۔ایضا

باب سوم

محبت اور رومان

امر تا پریتم کی تصانیف کا ایک اہم موضوع محبت اور رومان ہے ان کے بیشتر ناول اور افسانے اسی موضوع کے گرد گھومتے ہیں۔ امر تا کے کے نزدیک ذات پات اور مذہب کی تفریق ایک انتہائی معیوب چیز تھی وہ محبت کے جذبے کو ان سب سے ماورا قرار دیتی ہیں، وہ لکھتی ہیں کہ:

"یہ ایک وہ پل ہے جب گھر میں تو نہیں مگر رسوئی میں نانی کی حکومت تھی، سب سے پہلی بغاوت میں نے اس حکومت میں کی تھی، باورچی خانے میں تین گلاس ہمیشہ دوسرے برتنوں سے علیحدہ رہتے تھے یہ گلاس صرف ان موقعوں پر نکلتے جب گھر میں والد کے مسلمان دوست آتے تھے اور ان کو چائے یا لسی دینی ہوتی اور اس کے بعد پھر دھو مانجھ کر وہیں رکھ دیے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے بھی ضد پکڑ لی کہ میں کسی دوسرے برتن میں نا پانی پیوں گی نہ دودھ، نانی ان گلاسوں کو الگ رکھ سکتی تھیں مگر مجھے بھوکا پیاسا نہیں رکھ سکتی تھیں اسی لئے یہ بات والد صاحب تک پہنچ گئی، والد کو اس سے قبل معلوم نہ تھا کہ گلاس اس طرح علیحدہ رکھے جاتے ہیں، ان کو پتہ چلا تو میری بغاوت کامیاب ہو گئی ،اس گھڑی نانی کو گمان بھی نہ تھا کہ بڑی ہو کر زندگی کے کئی سال جس کے مونہہ عشق کروں گی وہ اسی مذہب کا ہو گا جس مذہب کے لوگوں کے لیے گھر کے برتن بھی اچھوت بنا دیے جاتے ہیں"(۱)۔

محبت امرتا کی زندگی کی شاید سب سے بڑی حقیقت تھی، وہ محبت کی مٹی سے گندھی ہوئی ایک ایسی عورت تھیں جو صرف محبت کرنا ہی نہیں جانتی تھیں بلکہ پورے ظرف کے ساتھ اسے نبھانا بھی جانتی تھیں، کہتے ہیں کہ لڑکی حسین ہو، تھوڑی ملنسار ہو اور علم و ادب (فنون لطیفہ) سے بھی تعلق ہو تو وہ موضوع گفتگو بن جاتی ہے اور اس کے ساتھ یکطرفہ چاہنے والوں اور ساتھ ساتھ ناکام رہ جانے والے حاسدوں کا بھی ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے امرتا پریتم اگرچہ اس سے خوش اسلوبی سے بچتی رہیں لیکن دل تو عورت کا بھی دھڑکتا اور مچلتا ہے۔

ان کی زندگی میں جن محبتوں نے شدت اختیار کی اور جن کی حدتوں نے انہیں بے کل کیا وہ بے کلی عمر بھر ان کے ساتھ چمٹی رہی جس کا اظہار وہ گاہے بگاہے اپنی تحریروں میں کرتی رہی ہیں ان محبتوں میں سب سے پہلا نام ساحر لدھیانوی کا ہے جس نے نہ صرف امرتا بلکہ ساحر کی زندگی بھی اتھل پتھل کر دی۔ ایک اور نام اس ضمن میں سجاد حیدر کا بھی ہے جو براڈکاسٹر، ریڈیو کے افسر اور پنجابی زبان کے لکھاری بھی تھے۔ امرتا پریتم بیک وقت ساحر سے اور سجاد حیدر سے کیسے پیار کرتی رہیں اور گھر گھرستی کو بھی (کچھ عرصہ تک) نبھائے رکھا یہ دلچسپ سوال اور انوکھی صورت حال ہے۔ یہ مفروضہ غلط ہے کہ عورت جیون میں صرف ایک ہی دفعہ پیار کرتی ہے ------! کیا عورت کے جذبات نہیں ہوتے؟ کیا اس کی پسند ناپسند نہیں ہوتی؟ کیا اسکی زندگی میں کمزور اور دلپذیر لمحے نہیں آسکتے؟ یہ ساری باتیں فلسفے سے پرکھنے کی نہیں، زندگی میں ڈوب کر جاننے کی ہیں۔

ممتاز ادیب حمید اختر نے:

> "میری کتاب ناکام محبت ساحر لدھیانوی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ امرتا آخری وقت تک ساحر سے پیار کرتی رہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ امروز کو اپنی زندگی کا حاصل بنا چکی تھیں وہ خود کہتی ہیں کہ ساحر ایک خواب تھا امروز تعبیر ہے، مگر امروز سے قربت اور محبت کے باوجود امرتا کے بھیتر کی بے

کلی اور اضطراب ختم نہ ہوا۔شاید ایسی شخصیات کے نصیب میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ کشمکش میں رہیں،بے سکون رہیں،اور عظیم ادب تخلیق کرتی رہیں۔امرتا کی نظمیں میرا کمرہ یاتر کے گھڑے کا در پانی یا اور بھی کسی نظم کو پرکھ لیں ایک بے چارگی، تنہائی اور نارسائی کا احساس نمایاں ملے گا، شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہوگی جس میں مکمل آسودگی جھلکتی ہو"(۲)۔

امرتا محبت کی ایک خاص انفرادی جہت پہ یقین رکھتی ہیں، پیار کی تعریف بیان کرتے ہوئے ایک دن کہنے لگیں ۔ایک عاشق کے دوسرے عاشق میں گم ہونے کی بات میں نہیں مانتی، کوئی کسی میں نہیں ڈوبتا، کہیں گم۔ نہیں ہوتا، دونوں الگ الگ فرد ہوتے ہیں ،اور ایک دوسرے سے الگ رہ کر ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہیں ان کے محبوب کا تصوراتی پیکر بے حد مضبوط اور بے حد جذباتی ہے۔

امرتا پریتم کی ایک دوست ڈاکٹر اوماترلوک اپنی کتاب امرتا کا امروز میں لکھتی ہیں:

"ایک دن میں نے امروز سے پوچھا" امرتا اتنے عرصے تک ساحر کے خیالوں میں اس کی یادوں میں کھوئی رہیں، آپ۔کو برا نہیں لگا؟انہوں نے جواب دیا نہیں، میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کسی جذبہ انا کے بغیر، کسی دعوے اور دلیل کے بغیر کسی تصنع سے ماورا،کسی حساب کتاب کے بغیر آپ پیار کرتے ہیں تو کوئی دشواری نہیں ہوتی اور جب کوئی سہل انداز میں نفس مطمئنہ میں جیتا ہے تو کیسی مشکل؟۔میں نے دریافت کیا کہ نفس مطمئنہ سے ان کی کیا مراد ہے تو انہوں نے ایک کہانی سے اسے واضح کیا ۔ایک گاؤں میں کہیں سے کوئی فقیر آکر رہنے لگتا ہے۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے اپنا ٹھکانہ بنالیتا ہے۔ گاؤں والے توفیق کے مطابق، جو کچھ بھی ہوتا فقیر کو دے جاتے اور اس کا گزارہ ہو جاتا۔ انہی دنوں گاؤں کے زمین دار کی بیٹی، جس سے پیار کرتی ہے، اس کے بچے کی ماں بن جاتی ہے۔ زمین دار کی بہت بدنامی ہوتی ہے۔ گاؤں والوں کو بھی بہت غصہ آتا ہے۔گھر والے لڑکی سے اس شخص کا نام

پوچھتے ہیں جس نے اسے اس انجام تک پہنچایا لیکن لڑکی اپنے محبوب کا نام نہیں بتاتی۔ اسے ڈر لگتا ہے کہ گاؤں والے اس کے محبوب کو مار ڈالیں گے۔ جب گھر والے کسی طرح نہیں مانتے تو وہ گھبرا کر فقیر کا نام لے دیتی ہے۔ جو سلوک لڑکی کے محبوب کے ساتھ ہوتا تھا وہ فقیر کے ساتھ ہوتا ہے، گاؤں والے اسے لعنت ملامت کرتے ہیں، مارتے پیٹتے ہیں اور بچہ بھی اس کے پاس پھینک آتے ہیں۔ کسی سے ایک لفظ کہے بغیر، فقیر اس بچے کو رکھ لیتا ہے، اپنا لیتا ہے۔ لیکن فقیر تو فقیر ہی تھا۔ اس کے پاس خود اپنے کھانے کو کچھ نہیں تھا، بچے کو کیا کھلاتا، کیسے پالتا، گھر گھر جا کر بچے کے لئے بھیک مانگنے لگا لیکن اب اس کے لئے سارے دروازے بند ہو گئے تھے۔ ایک دن جب وہ روتے بلکتے بچے کو لے کر زمین دار کے گھر کے آگے سے گزر رہا تھا، تو بچے کا رونا سن کر اس کی ماں سے رہا نہیں گیا، وہ بے چین ہو کر بھاگتی ہوئی آئی اور بچے کو گود میں لے کر دودھ پلانے لگی اور روتے روتے بتایا کہ یہ فقیر کا نہیں، بلکہ اس کے محبوب کا ہے۔ گاؤں والوں کو بہت پشیمانی ہوتی ہے، وہ سب فقیر سے معافی مانگتے ہیں۔ اب دیکھو، بچہ فقیر کا نہیں تھا لیکن اس نے بچے کو بھی اپنا لیا اور سارا الزام بھی اپنے سر لے لیا۔ یہی سیج بھاؤ (نفس مطمئنہ) ہے۔ جسے کسی بات سے کوئی فرق نہ پڑے وہی سیج یا مطمئن ہو سکتا۔ امروز بول رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ ایسا ہونا کتنا مشکل ہے کیا اسی سے انسان روحانی بلندیوں کو چھوتا ہے"(۳)۔

عورت کی خودی اور آزادی

امرتا پریتم ایک خود مختار اور مضبوط عورت تھیں، زندگی کے کئی محاذوں پر وہ عورت ہوتے ہوئے بھی تنہا لڑتی رہیں وہ اس بات پر یقین رکھتی تھیں کہ ایک مضبوط عورت کے لئے یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ وہ خود اپنی عزت کرنا جانتی ہو، صحیح اور غلط کا فیصلہ وہ دوسروں کی رائے کے بجائے اس کسوٹی پر کرے جو عقلی دلائل سے درست معلوم ہوتی ہوں اور امرتا نہ صرف خود ان تمام خوبیوں پر پوری اترتی ہیں بلکہ ان کی زندگی اور اس میں لیے گئے ان کے فیصلے اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ عورت اگر اپنی عزت کرنا جانتی ہو، خود سے محبت کرنا سیکھ چکی ہو تو وہ ہر کمزور ذہنیت کے انسان (خواہ مرد ہو یا عورت) کی طرف سے آنے والے تیروں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس بات کا واضح ثبوت امرتا کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو

"۵ ستمبر ۱۹۷۳ کی رات تھی شب کے ساڑھے دس بجے تھے میں کازان زاکس کی کتاب دراک گارڈن پڑھ رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنی بجی۔ ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا فون تھا کہہ رہے تھے صبح سنڈیکیٹ کی میٹنگ ہے جس میں تمھاری کہانی ایک شہر کی موت کے خلاف resolution پاس ہونا ہے، میں تمھارے والد کا دوست ہوا کرتا تھا ان کی عزت کرتا تھا اس لیے تم کو فون کر رہا ہوں کہ تمھاری کہانی ایک شہر کی موت کے ساتھ تمھاری تحریر کی بھی موت ہو گئی ہے۔

میں نے یہ موت کی خبر سنی، وائس چانسلر سچ مچ اس موت پر افسوس کر رہے تھے اس لیے ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کر کے پوچھا آپ نے یہ کہانی پڑھی ہے؟

انہوں نے جواب دیا: نہیں مجھے لٹریچر کے بارے میں زیادہ علم نہیں میں تو سائنس کا آدمی ہوں۔ میں نے کہا: آپ کو لٹریچر کے بارے میں زیادہ علم نہیں لیکن میں آپ کی فراست پر اعتماد کر کے کہنا

چاہوں گی کہ آپ ایک بار اس کہانی کو پڑھیں ۔انہوں نے جواب دیا: میرے پاس اس کہانی کے synopsis آئے ہیں وہ برے ہیں۔ Synopsis ہو سکتا ہے صحیح نہیں ہوں ۔ Synopsis کیسے غلط ہو سکتے ہیں؟ ۔کوئی prejudiced مائنڈ لکھے تو وہ غلط ہو سکتے ہیں۔ہاں یہ صحیح ہے ۔تاہم جب کہانی موجود ہے تو اس کو پڑھنے کی زحمت کی جا سکتی ہے۔ہمارا کوئی آدمی رجسٹرار اگر دہلی آئے تو اس کو وقت دے دینا اس کے ساتھ کہانی کو ڈسکس کر لینا۔آپ خود پڑھیں گے تو مجھے فون کیجیے گا، میں کہانی کو آپ کے ساتھ ڈسکس کر سکتی ہوں۔اچھا آئندہ ہفتے فون کروں گا آج میں نے بے وقت فون کیا۔اصل میں میں تمھارے والد کا احترام کرتا تھا وہ بڑے بلند خیال انسان تھے، تمھاری عزت بھی کرنا چاہتا ہوں

لیکن وہ مجھے پڑھے بغیر نہیں ہو سکتی تم ایسا لکھو کہ لوگ تمھاری عزت کر سکیں ۔

فکر نہ کیجیے جب تک میری نگاہوں میں میری عزت ہے میری ناموس پر حرف نہیں آ سکتا۔میری طرح میری عزت نے بھی ساری عمر کسی پر انحصار نہیں کیا، فون بند ہو گیا تو وہ بھی میری طرح ہنس رہی تھی"(٤)۔

"امروز کے مطابق امرتا مالی اور پر کبھی کس پر منحصر ہونا پسند نہیں کرتی۔لاہور میں جن دنوں وہ ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتی تھی، تب ایک دن گھر کے ایک بزرگ نے اس سے پوچھا کہ اسے اس کام کے عوض کتنے پیسے ملتے ہیں، جب امرتا نے جواب دیا" دس روپے تو وہ بولے تم مجھ سے بیں روپے لے لیا کرو لیکن ریڈیو پر کام کرنا چھوڑ دو۔"

امرتا نہیں مانی، کیوں کہ پیسوں سے زیادہ اسے اپنی آزادی پسند تھی، اپنا خود کفیل ہونا اچھا تھا۔ایک بات پر امرتا اور امروز بالکل متفق ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ مذہب اور ماں باپ دونوں ہی بچوں کو دبا کر،

ڈرا کر اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ خوف زدہ بچہ خوف زدہ سماج بناتا ہے اور ایسے خوف زدہ سماج میں صحت مند رشتے کیسے بن سکتے ہیں۔ ایک اچھا صحت مند تعلق تبھی بنتا ہے جب یہ سہل اور فطری انداز میں قائم ہوتا ہے"(۵)۔

امرتا پریتم کی آزاد فطرت، ذات کے عرفان، اور وجودی بیداری اس نظم میں پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ "میرا پتہ" میں وہ اپنے گھر کا نمبر، گلی کا نام، راستوں کی سمتیں سب مٹا دیتی ہیں—یہ محض مکان کی نفی نہیں بلکہ اس سماج کی نشاندہی ہے جو عورت کو شناخت، حدود اور پابندیوں میں قید رکھتا ہے۔

میرا پتہ، امرتا پریتم، ترجمہ: فہمیدہ ریاض۔

آج میں نے اپنے گھر کا نمبر مٹا دیا ہے اور گلی کی پیشانی پر ثبت گلی کا نام ہٹا دیا ہے

ہر سڑک کی سمت کا نام پونچھ دیا ہے

اگر مجھے ڈھونڈھنا چاہو

تو ہر ملک کے ہر شہر کی گلی کا دروازہ کھٹکھٹاؤ

یہ ایک کلمہ خیر ہے باعث شہر ہے

جہاں بھی اک آزاد روح کی جھلک دکھائی دے سمجھنا وہ میرا گھر ہے"(٦)

ہجرت اور تقسیم ہند کا کرب

امر تا پریتم نے اپنے ناول پنجر میں تقسیم ہندوستان کے دوران ہونے والے فسادات کو بھی اپنے ناول کا حصہ بنایاہے، انہوں نے پنجاب کے شہر گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں آنکھ کھولی اور اسی ماحول اور تہذیب میں پلی بڑھیں ، یہاں کی روایت ان کی گھٹی میں شامل تھیں ،انہوں نے مقامی محبتوں اور رنجشوں کا ذائقہ چکھا اور انہیں اپنی تحریروں کا موضوع بنایا، انہوں نے اپنی آنکھوں سے فسادات میں ہونے والے مظالم کو دیکھا، خاص طور پر عورت کے دکھ کو بہت گہرائی سے محسوس کیا۔امر تا پریتم نے منضبط انداز میں پورو کی داستان کو ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی عورت کی داستان بنادیا اور اپنی اس کہانی کا کینوس وسیع کرتے ہوئے تقسیم ہندوستان کے دوران خواتین کو پیش آنے والے مسائل کی تفہیم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

"انہوں نے اپنے اس ناول میں فسادات کے موضوع کو شامل کر کے تقسیم۔کے دوران عورتوں کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کو کہانی کا حصہ بنایاہے۔امر تا پریتم نے پورو کی شکل میں ایک مظلوم عورت کے ساتھ ہونے والے سلوک کو اتنی مہارت سے سمویا ہے کہ کہانی کے سارے حالات وواقعات باہم جذب ہو گئے ہیں اور ان میں توازن کی کیفیت نمایاں ہے"(۷)۔

ذاتی زندگی کے عکاس موضوعات

امر تا پریتم کی تصانیف کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیشتر تحریریں ان کی ذاتی زندگی کی عکاس ہیں وہ لکھتی ہیں:

"زندگی کے ہر اتار چڑھاؤ میں جو سدا ساتھ رہتا ہے وہ میرا قلم ہے، چاہے کوئی حادثہ میری اکیلی چھاتی پر گزرتا یا پھر تقسیم ملک کی طرح سب کا مشترکہ دکھ ہوتا، یہ قلم میرے اعضاء کی مانند میرا حصہ بن کے، بدن بن کے ساتھ رہتا"(۸)۔

ایک اور مقام پر امرتا لکھتی ہیں:

"مصنف کی اپنی زندگی کے حادثے، ناولوں کہانیوں کے کرداروں میں ہمیشہ داخل ہوا کرتے ہیں اپنے ناول ایک سوال میں انہوں نے اپنی زندگی کی کہانی کو جگدیپ کے روپ میں پیش کیا ہے وہ لکھتی ہیں: ہیرو جگدیپ اپنی مرتی ہوئی ماں کے بستر کے پاس جس طرح کھڑا ہے اسی طرح میں اپنی مرتی ہوئی ماں کے بستر کے پاس کھڑی تھی اور میں نے جگدیپ کی مانند دل اور ذہن کی یکسوئی کے ساتھ خدا سے کہا تھا میری "میری ماں کو نہ مارنا اور مجھے جگدیپ کی طرح یقین ہو گیا تھا کہ اب میری ماں نہیں مرے گی کیونکہ خدا بچوں کا کہا نہیں ٹالتا لیکن ماں مر گئی تھی اور میرا بھی جگدیپ کی طرح خدا پر سے اعتقاد اٹھ گیا تھا۔ اور جس طرح جگدیپ اس ناول میں ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کو سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے کہ "ان روٹیوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے کئی دن کھاؤں" اسی طرح میں نے ان سوکھی روٹیوں کو پیس کر ایک شیشی میں ڈال لیا تھا۔ یہ سب کچھ میں نے شعوری طور پر اس ناول میں داخل کیا تھا ۔اسی طرح یاتری ناول میں میں نے شعوری طور پر اپنے والد کی یاد داخل نہیں کی تھی لیکن کئی سال بعد جب میں نے اس ناول کو پڑھا اور جب مہنت کرپا ساگر کی موت کے بعد ناول کا ہیرو اس کی آواز کو دل میں یاد کرتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ میں خود اپنے باپ کی آواز کو یاد میں لا رہی تھی۔ میں میرے ناول دھرتی ساگر اور سپیاں پر جب فلم بن رہی تھی تو ڈائریکٹر نے مجھے فلم کا ایک گیت لکھنے کے لیے کہا، سچویشن وہ بتائی، جب چیتنا سماجی منظوری کے خیال کو ہاتھ سے پرے کر کے اپنے محبوب کو اپنے دل اور جسم میں حاصل کر لیتی ہے اور اس وصل اور سوز کے مقام اتصال پر

کھڑی چیتنا کو سامنے رکھ کر میں جب گیت لکھنے لگی تو اچانک وہ گیت سامنے آگیا جو میں نے ۱۹۶۰ میں امروز سے پہلے ملن کے موقع پر لکھ تھا، جو اذیت میں نے اپنے دل پر کھیلی تھی محسوس ہوا کہ وہی اب چیتنا نے جھیلنی ہے"(۸)۔

اس کے علاوہ امرتا پریتم کے اور ناولوں اور تحریروں میں بھی ان کی ذاتی زندگی کی جھلک نمایاں ہے ایک تھی انیتا اور دلی دیا گلیاں میں انہوں نے اپنے اور ساحر کے تعلقات کو کرداروں کی شکل میں بیان کیا ہے۔ الغرض امرتا پریتم کی تصانیف کو پڑھ کر قاری بخوبی ان کی زندگی کی کہانی سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔

حواشی:

(۱)۔ رسیدی ٹکٹ، امرتا پریتم، علم و عرفان پبلیشر، جون ۲۰۰۷، ص، ۱۲

(۲)۔ امرتا پریتم کی شاعری، تراجم، فہمیدہ ریاض، نگارشات پبلیشر، سن اشاعت، ۲۰۱۹، ص، ۱۸، ۱۷

(۳)۔ امرتا لوک، ناشر، پینگوئین بکس انڈیا، سن اشاعت، ۲۰۰۶، ص، ۱۴۴، ۱۴۳

(۴)۔ رسیدی ٹکٹ، امرتا پریتم، علم و عرفان پبلیشر، جون ۲۰۰۷، ص، ۱۴۲

(۵)۔ امرتا لوک، ناشر، پینگوئین بکس انڈیا، سن، اشاعت، ۲۰۰۶، ص،، ۱۴۳

(٦) ایضا، ص، ۱۴۳

(۷)۔ رسیدی ٹکٹ، امرتا پریتم، علم و عرفان پبلیشر، جون ۲۰۰۷، ص، ۱۳۴

(۸)۔ ایضا، ص، ۱۰۸

باب چہارم

امر تا پریتم (۲۰۰۵۔۱۹۱۹) بیسویں صدی کی ایک نامور پنجابی اور اردو زبان کی شاعرہ، ناول نگار اور ادبی نقاد تھیں۔ ان کی ادبی خدمات کو برِ صغیر کی تاریخ بالخصوص تقسیم ہند، عورتوں کے حقوق اور انسانی درد و کرب کے تناظر میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ عورت کے جذبات و احساسات کی گہرائی کو فکری سطح پر امر تا پریتم نے جس انداز سے اجاگر کیا ہے یہ ان کا ہی کمال ہے۔

امر تا پریتم کے نزدیک عورت کو ہر طرح کی بدنامی سے بچنے کے لیے ایک گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور مرد کو دن رات غلامی کرنے والے نوکر کی اسے عورت اچھا نوکر نہیں مل سکتا۔ اس لیے روٹی کپڑا منظور کر کے مرد یہ سودا منظور کر لیتا ہے۔ اور اسے ہمارے سماج میں بیاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عورت کی حیثیت اور قدرو منزلت جو اس سماج میں اسے حاصل ہے اس کا بیان انہوں نے انتہائی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

مرد کی نظر میں عورت کی کیا حیثیت ہے وہ کن نظروں سے اسے دیکھتا ہے اس کا عکس امر تا پریتم کی تحریروں میں جابجا نظر آتا ہے۔ اپنے ناول ناگ منی میں انھوں نے مرد کی انا کی نہایت خوبصورت تصویر کشی کی ہے ۔کمار نامی شخص جو الکا کو محض اپنی جسمانی بھوک مٹانے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس بات سے گریزاں ہے کہ کہیں وہ الکا سے محبت نہ کر بیٹھے وہ صرف اپنی انا کی وجہ سے اس جذبات کو ماننے سے قاصر ہے جو الکا کے لیے اس کے دل میں موجود تھے۔

نفسیاتی کشمکش کا شکار یہ نوجوان ایک طرف الکا کو خود سے دور کرنے کی کوشش میں مگن ہے۔ اور دوسری طرف اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر پا رہا، دوسری طرف الکا عورت ذات کی وفا اور کردار کی مصنوعی کا خوبصورت کردار ہے۔ جو جذبات کی شدت کے باوجود ایک سمجھدار عورت ہے۔ اور مرد کی نفسیات سے آگاہ ہے۔ کمار کے بار بار رد کرنے اور ٹھکرائے جانے کے باوجود اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اس کہانی میں الکا کے کردار میں عورت کی لازوال محبت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ گویا وہ ہار کر بھی جیت گئی۔

"شہرت اور عورت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ شہرت اپنے آپ کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتی اور نہ ہی پیسہ دیتا ہے لیکن عورت اس سلسلہ میں اس طرح مدد کرتی ہے جس طرح کسی کا فن اس کی مدد کرتا ہے۔ (۱)"

"فن کار کا ایک رنگ ایک عضو ہی ہوتا ہے۔ جیسے ہاتھ یا پاؤں، محبت بھی ہمارا ایک انگ ہی ہوتی ہے، جیسے آنکھیں، زبان، شاید اس سے بھی زیادہ۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کمار کو الکا کا خیال شاید اس لیے کہ جوں جوں دن نکل رہا تھا الکا کی آمد کا وقت قریب آ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرے جسم میں پھر کوئی بھوک پیدا ہو رہی ہے۔ عورت کا خواب مجھے اس بھوک کے بغیر نہیں آ سکتا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ الکا تم ایک شریف لڑکی ہو شریف ماں باپ کی بیٹی ہو۔ اس میں شرافت کا سوال کہاں سے آ گیا۔ روپیہ لے کر جسم دینا شرافت نہیں ہے۔ پھر اس لحاظ سے روپیہ دے کر جسم لینا بھی شرافت نہیں ہے۔ کمار چپ ہو گیا ہے۔ الکا پھر بولی، اگر آپ اپنے لیے شرافت کو ضروری نہیں سمجھتے تو میرے لیے کیوں ضروری سمجھتے ہیں" (۲)۔

میری اور بات ہے کمارنے کہا

"صرف اس لیے کہ مردوں کے لیے ایک وہ چیز بھی شرافت ہوتی ہے"(۳)۔

جو عورت کے لیے نہیں ہوتی۔امرتا پریتم کی سوچ عورت کی خود مختاری اور شخصی آزادی کی عکاس تھی۔۔

اپنی سوانح رسیدی ٹکٹ میں وہ لکھتی ہیں:

"مرد نے عورت کے ساتھ صرف سوناہی سیکھاہے۔جاگنا نہیں اس لیے عورت اور مرد کا رشتہ الجھن کا شکار ہے۔امرتا پریتم کا ناول ایک تھی سارا،سارا شگفتہ کی شخصیت اور زندگی کی روداد ہے۔سارا شگفتہ اردو کی جدید شاعرات میں سے ایک تھیں،غریب اور ان پڑھ خاندان کی تھیں کم عمری میں کئی شادیاں ہوئیں ان شادیوں سے سارا کو ذہنی کوفت میں ڈالا دیا جس کی وجہ سے انہیں اذیت پاگل خانے میں ڈال دیا گیا۔

پاگل خانے میں کئی بارس ارانے خودکشی کی کوشش کی مگر ناکام رہی مگر یہ جون ۱۹۸٤ کو کراچی میں ٹرین کے نیچے آکر جان دے دی۔ان کی وفات کے بعد ان کی شخصیت پر امرتا پریتم نے ان کی زندگی کے حوالے سے یہ ناول تحریر کیا اس ناول میں انھوں نے سارا کو ایک انسان کی شکل میں دیکھا ہے بعد میں عورت کے روپ میں"(٤)۔

"میں نے آسمان سے ایک تاراٹوٹتے دیکھاہے۔بہت تیزی سے آسمان کے ذہن میں ایک جلتی ہوئی لکیر کھنیچتا ہوا۔لوگ کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہوں گے کہ انھوں نے کئی بار ٹوٹے ہوئے ستاروں کی گرم راکھ اپنے دل کے آنگن میں برستی ہوئی دیکھی ہے"(٥)۔

"جس طرح تاروں کے نام ہوتے ہیں اس طرح جو تارامیں نے ٹوٹتے ہوئے دیکھا اس کا بھی ایک نام تھاسارا شگفتہ۔اس تارے کے ٹوٹتے وقت آسمان کے ذہن میں جو لمبی اور جلتی ہوئی لکیر کھینچ گئی تھی۔

وہ لکیر سارا شگفتہ کی نظم تھی۔ نظم زمین پر گری تو خدا جانے اس کے کتنے ٹکڑے ہوا میں کھو گئے لیکن جو راکھ میں نے ہاتھ سے چھو کر دیکھی تھی اس میں کتنے ہی جلتے ہوئے حروف تھے جو میں نے اٹھا اٹھا کر کاغذوں پر رکھ لیے۔ جن لوگوں کے پاس احساس ہے جلتے ہوئے حروف پڑھتے ہوئے ان کے احساس سلگنے لگتے ہیں مگر کوئی کاغذ نہیں جلتا۔ سارا کی نظم کے کچھ لفظ ہوا میں کھڑے تھے عزت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ گھونگٹ، تھپڑ اور گندم۔ عزت کا سب سے چھوٹا اور بڑا حوالہ عورت ہے۔ گھر سے لے کر فٹ پاتھ تک کچھ بھی ہمارا نہیں عزت ہمارے گزارے کی بات ہے "(٦)۔

"تم ڈر میں بچے جنتی ہو اس لیے آج تمھاری کوئی نسل نہیں تم جسم کے ایک بند سے پکاری جاتی ہو۔ تمھاری حیثیت میں تو چال رکھ دی گئی ہے۔ ایک خوبصورت چال۔ جھوٹی مسکراہٹ تمھارے لبوں پر تراش دی گئی ہے۔ تم صدیوں سے نہیں روئیں۔ کیا ماں ایسی ہوتی ہے کہ مقبرے کی سجاوٹ کہلائے۔ تمھارا نمک کیا ہوا۔ سارا سے جب ملاقات ہوئی تھی وہ ہندوستان ۱۹۸۰ میں آئی تھی۔ کہنے لگی۔ امرتا باجی میں نے بہت دور دور تک عورت کو سوئے ہوئے دیکھا ہے اور جانا کہ سوئی ہوئی آنکھ کو جو ثواب پیش کیا جاتا ہے۔ میں اس کی قائل نہیں ہوں جاگتی آنکھ جھوٹا پانی ہے میں نہیں چاہتی کہ عورت جھوٹا پانی پیے۔ میں نے بیچ میں ٹوک دیا سارا جاگتی آنکھ سے تیری کیا مراد ہے؟

جاگتی آنکھ تو روح کی آگہی ہوتی ہے۔ وہ نہیں دی تھی کہنے لگی جاگتی آنکھ سے میری مراد شوہر ہے۔ لیکن امرتا باجی تم ٹھیک کہتی ہو وہی شوہر جو سوئی آنکھ کا خواب تھا اگر جاگتی آنکھ میں آگہی نہ ہوتی تو وہ جھوٹا پانی کیسے لگتا۔ میں نے جب سوئی ہوئی آنکھ کے ثواب سے آنکھ کھولی تو گھونگٹ میں ٹوٹے ہوئے چاند دیکھے۔ دیکھا کہ مہندی نے میرے ہاتھ نہیں رنگے تھے بلکہ اور سفید کر دیئے تھے "(۷)۔

"ایسے لگا جیسے میرے سفید کپڑوں پر رنگین دھاگوں سے میرا کفن سل گیا ہے "(۸)

امر تا پریتم کی مشہور نظم

"آج آکھاں وارث شاہ نوں"(۹) نے امر تا کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ان کی آواز بر صغیر کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ یہ ہر اس ہستی کی نظم ہے۔ جہاں نسل، رنگ یا مذہب کی بنیاد پر انسان، انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ بن جاتا ہے۔ پنجابی ادب میں اس نظم کی گونج تا دیر تک قائم رہے گی۔ اس نظم سے امر تا کا جو ادبی سفر شروع ہوا وہ آخری عمر تک جاری رہا۔ بعض ادبی حلقوں میں ان پر سخت تنقید بھی کی پنجاب کے بہت سے اخبارات اور جرائد میں شدید اعتراضات ہوئے تھے۔

سکھوں کو اعتراض تھا کہ انھوں نے یہ نظم وارث شاہ کو مخاطب کر کے کیوں لکھی۔ اس میں انھیں اپنا اور پنجاب کی عورت کا دکھ درد گرونانک سے کہنا چاہیے تھا۔ کمیونسٹ اس بات پر ناراض تھے کہ "یہ نظم لینن یا اسٹالن "(۱۰)۔ کو مخاطب کر کے کیوں نہیں لکھی گئی۔

تقسیم ہند کے بعد ظلم و جبر اور فسادات کی جو آندھی چلی اس میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ سب سے زیادہ متاثر پنجاب ہوا۔ پنجاب کی بیٹی ہونے کے ناطے انھوں نے اس فسادات کے دوران اپنے دیس میں ۱۴ مارچ سے ۱۵ اگست اور اس کے بعد ہونے والے کشت و خون پر طویل نظم لکھی جسے پنجاب کا نوحہ بھی کہا جاتا ہے۔" آج آکھاں وارث شاہ نوں بھی اس نظم کا حصہ ہے"۔ آج آکھاں وارث شاہ نوں میں کہتی ہوں

"آج وارث شاہ سے کہتی ہوں میں تربت سے بول

اور کتاب دردِ الفت کا نیا اک باب کھول،

روئی تھی جب فرطِ غم سے دختر پنجاب ایک

آنسوؤں کا تو نے جاری کر دیا سیلاب ایک

آج لاکھوں بیٹیاں پنجاب کی ہیں اشک بار

یاد کرتی ہیں تجھے دل دوز ہے ان کی پکار

اے انھیں درد مند اس اک نظر پنجاب پر

جنگلوں میں بے کفن لاشوں کا بھی نظارہ کر

بے گناہوں کے لہو سے آج رنگیں ہے چناب

ظالموں کے واسطے ساماں تسکیں ہے چناب

آج وارث شاہ سے کہتی ہوں میں تربت اور

کتاب دردِ الفت کا نیا اک باب کھول"

امرتا پریتم کی آخری کتاب "میں تینوں فیر ملاں گی"(۱۱) نظموں کا مجموعہ تھا یہ نظم انھوں نے امروز کے لیے لکھی تھی۔ جس کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہے۔

"میں تمھیں پھر ملوں گی

کہاں کیسے پتہ نہیں

شاید تمھارے خیالوں کی چنگاری بن کر تمھارے کینوس پر اتروں گی

یاشاید تمھارے کینوس پر ریکھا بن کر خاموش تمھیں دیکھتی رہوں گی

میں تمھیں پھر ملوں گی

کہاں کیسے، پتہ نہیں

سورج کی رو بن کر

ترے رنگوں میں گھلی رہوں گی

یا رنگوں کی بانہوں میں بیٹھ کر

ترے کینوس پر بچھ جاؤں گی

پتہ نہیں کس طرح

پر تمھیں ضرور ملوں گی

میں اور کچھ نہیں جانتی

پر اتنا جانتی ہوں

کہ وقت جو بھی کرے گا

یہ جنم میرے ساتھ ملے گا

یہ جنم ختم ہوتا ہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے

یہ یادوں کے دھاگے

کائنات کے لمحوں کی طرح ہوتے ہیں

میں لمحوں کو چنوں گی

اور ان دھاگوں کو سمیٹوں گی

میں تمھیں پھر ملوں گی"

امر تا اپنی کتاب آخری خط کا سرِ ورق ڈیزائن کروانے کسی سیٹھی نامی پینٹر کے پاس گئی جس نے اسے عظیم مصور امروز کے بارے میں بتایا اور پھر امروز نے اس کی فرمائش پر اس کی کتاب کا سرورق ڈیزائن کر کے دیا۔ امروز کے مطابق انھیں ڈیزائن کے ساتھ ساتھ آرٹسٹ بھی پسند آیا۔

وہ روز امرتا کو ریڈیو اسٹیشن جاتے ہوئے دیکھتا تھا ایک دن اس نے امرتا سے اسکوٹر پر لفٹ کا پوچھا اس نے انکار نہیں کیا جس کے بعد معمول بن گیا وہ اسے روز ریڈیو اسٹیشن چھوڑ کر آتا اور شام کو واپس لے آتا۔ امرتا اور امروز کے محبت درمیان یہ تعلق ٤٥ برس کے عرصے پر محیط رہا۔

یہ عجیب طرح کا سمبندھ اور سنجوگ تھا نہ پھیرے ہوئے نہ بیاہ کی با قاعدہ رسم لیکن عمر بھر اکٹھے رہے۔

" امرتا کی ہندوستانی دوست اوماترلوک نے امرتا اور امروز کے عنوان سے ایک انگریزی کتاب بھی لکھی "(١٢) جس کا دلی میں اردو ترجمہ بھی کیا گیا۔ سکھ برادری امرتا کے اس عمل سے خاصی ناراض تھی اور کئی طرح سے ان کا سماجی بائیکاٹ (مقاطع) کر رکھا تھا۔

امر تا پریتم کا ناول ایک تھی انیتا ان کی ذاتی زندگی کی پرچھائیاں ہیں۔ اس ناول میں انہوں نے اپنی اور ساحر کی محبت کا بیان ناول کے کرداروں کے ذریعے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

"امرتا کی منگنی پریتم سنگھ سے اس وقت ہو چکی تھی جب وہ صرف چار برس کی تھی"(۱۳)

سولہ سال کی عمر میں اس کی شادی پریتم سنگھ سے ہو جاتی ہے۔ امرتا پریتم جب ساحر سے ملی تو اس وقت وہ پریتم سنگھ کے ساتھ رشتہ ازواج میں بندھی ہوئی تھیں۔ شادی کا یہ بندھن خوشگوار نہیں تھا امرتا کا ساحر سے رشتہ ان خطوط سے واضح ہوتا ہے جو انھوں نے ایک دوسرے کو لکھے۔ ساحر لاہور میں تھا اور امرتا دہلی میں۔ اپنے درمیانی فاصلے کی خلیج کو دونوں نے الفاظ کے پل سے پاٹا بعد کیا۔ وہ ساحر کو میرا شاعر، میرا محبوب، میرا خدا اور میرا دیوتا کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ امرتا وہ واحد عورت تھی۔ جس نے ساحر کو اپنے اکیلے رہنے کے فیصلے کو تبدیل کرنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا وہ امرتا ہی تھی جس کے بارے میں ساحر نے ایک بار اپنی ماں سے کہا تھا" وہ امرتا پریتم تھی وہ آپ کی بہو بن سکتی تھی"۔

اس کے باوجود ساحر نے کبھی امرتا سے کوئی وعدہ نہیں کیا ان کے درمیان محبت فاصلوں کی دوری پر تھی اور ساحر اس فاصلے کو کم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو خطوط لکھتے، چھپ کر ملتے لیکن اس محبت میں الفاظ سے زیادہ خاموشی ہوتی تھی"۔ اپنی سوانح عمری رسیدی ٹکٹ میں امرتا لکھتی ہیں کہ کیسے وہ اور ساحر خاموشی سے بیٹھے ایک دوسرے کو تکتے اور ساحر سگریٹ پر سگریٹ سلگتا رہتا۔ جب وہ چلا جاتا تو امرتا بجھے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کو الماری میں رکھ لیا کرتیں تھیں۔ پھر تنہائی میں ان ٹکڑوں کو چھوتی جس سے اسے

"ساحر کی موجودگی کا اس کے لمس کا احساس ہوتا"۔(۱٤)

ایک تھی انیتاناول میں بھی امر تانے ساگر کے جانے کے بعد انیتا کو سگریٹ کے ٹکڑے چن کر رکھتے اور تنہائی میں اسے محسوس کرتے دکھایاہے۔امر تا کے ناول پڑھنے کے بعد لڑکیاں اکثرناولوں میں دیے گئے کرداروں کو زندگی کو اپنی زندگی سے ملاتی تھیں۔ایک تھی انتیاناول جب اردو میں شایع ہوا تو حیدر آباد سے چکلے میں رہنے والی "ایک عورت نے امر تاکو خط لکھااور کہا کہ یہ میری کہانی ہے"۔(۱۵)

آپ رسیدی ٹکٹ میں لکھتی ہیں کہ

"ایک بار مرن شرماٹیلی وژن پر میرا انٹر ویولے رہے تھے۔انھوں نے سوال کیا امر تا تمھارے ناولوں کو پڑھ کر لڑکیاں اپنے سچ کی تلاش میں بنے ہوئے گھروں کو مسمار کر دیتی ہیں۔کیا یہ سماج کے لیے نقصان دہ ہیں۔بے ساختہ زبان پر جواب آیا" شرماجی آج تک جتنے گھر ٹوٹتے رہے ہیں جھوٹ کے ہاتھوں ٹوٹتے رہے ہیں اب سچ کے ہاتھوں بھی ٹوٹ لینے دیجیے"۔(۱۶)

امر تاپریتم اپنی سوانح رسیدی ٹکٹ کے بارے میں لکھتی ہیں:

"جب رسیدی ٹکٹ شائع ہوئی اور میں نے اپنی سب سے قریبی دوست اوتار کو یہ کتاب بھیجی تو اس کے صفحہ اول پر لکھامیری دوست تجھے توسب کچھ معلوم ہی ہے لیکن دیکھ آج سارے عالم کو اپنے زخم دکھادیے۔اس ایک سطر میں سب کچھ کا علم ہونے کا ایک لمباعرصہ ہے، سینتیس برس کا"۔(۱۷)

گویایہ خودنوشت ان کی ذاتی زندگی کے ایک ایک پل کی بولتی چالتی تصویر ہو۔

بچپن سے لے کر جوانی تک کے تمام واقعات، مزہبی بند شیں، واردات قلبی، عملی زندگی، ادبی سفر اور زندگی کا آخری پڑاؤیعنی سب کچھ ہی اس میں امر تانے خود ہی بیان کر کے رکھ دیاہے اور ایسا کرناوہ بھی کسی عورت کے لئے یقیناً اس کی جرات و بیباکی پر دلالت کر تاہے زندگی کے بہت سارے گوشے، بہت سارے راز انسان دوسروں پر آشکار کرنے

کی ہمت تا دم حیات نہیں جٹا پاتا اور اکثر اوقات ان واقعات کا اظہار بزبان قلم لکھنے والے کے لئے کافی مشکل بھی ہوتا ہے مگر امرتا نے جس دلیری اور سچائی کے ساتھ زندگی کی نامہربانیوں کا بیان کیا ہے یہ ان ہی کا وصف ہے، قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایک حرف سچائی پر مبنی ہے اور شاید یہ ان الفاظ کی سچائی کی ہی طاقت کہ برسوں گزر جانے کے باوجود بھی ارتا پریتم کا نام ادبی حلقوں میں ایک اہم نام ہے، جب بھی نسائی ادب کی بات کی جاتی ہے، عورت کے لئے آزادی اظہار اور آزادیِ رائے کی بات آتی ہے تو ذہن میں امرتا کا خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے، زندگی کے ایک ایک پہلو کو جزیات کے ساتھ بیان کرتے ہوئے نہ تو انہیں کسی کا ڈر محسوس ہو اور نہ ہی بدنامی کا خوف۔ امرتا پریتم لکھتی ہیں :

"ہندو دھرم کے مطابق زندگی کے چار پڑاؤ ہوتے ہیں، چار دن چار آشرم ان کے مطابق مجھے زیادہ علم نہیں لیکن زندگی کے سفر میں میں نے اپنی قلبی و ذہنی حالت کے چار پڑاؤ ضرور دیکھے ہیں اور ان کے بارے میں کچھ مفصل کہہ سکتی ہوں

پہلا پڑاؤ تھا شعور، یہ ایک بچے کی ذہنی حالت تھی جس کو ہر چیز اچھنبا لگتی ہے جس کو چھوٹی سے چھوٹی چیز کے ساتھ بڑی سے بڑی دلچسپی جاگ پڑتی ہے اور جو جھٹ بلک اٹھتی ہے اور جھٹ بہل جاتی ہے۔ دوسرا پڑاؤ تھا شعور کا یہ ایک گداز بدن خوردرو جوانی کی مانند تھی جس کا غضب بڑا قوی ہوتا ہے ،بڑا خونبار جو زندگی کی غلط قدروں کے ساتھ جب بگڑ بیٹھتی ہے ماننے میں نہیں آتی اور جو سانپ کی طرح نفرت کو منی سمجھ کر اپنی پیشانی میں سنبھال رکھتی ہے ۔ تیسرا پڑاؤ تھا دلیری، حال کو ادھیڑنے اور مستقبل کو سینے والی دلیری خوابوں کو تلاش کے پتوں کی طرح ملا کر اور بانٹ کر کوئی کھیل کھیلنے کی دلیری جس کی کوئی بھی ہار دائمی ہار نہیں ہوتی جس کے پتے پھر سے ملائے جاسکتے ہیں اور جیت کی امید پھر سے باندھی جاسکتی ہے اور اب چوتھا پڑاؤ ہے تنہائی"۔(۱۸)

رسیدی ٹکٹ کیا ہے اس کے بارے میں امرتا خود بتاتی ہیں:

"ایک دن خشونت سنگھ نے دوران گفتگو کہا تمھاری سوانح کا کیا ہے بس ایک حادثہ، لکھنے بیٹھو تو رسیدی ٹکٹ کی پشت پر درج ہو جائے رسیدی ٹکٹ شاید اس لئے کہا کہ باقی ٹکٹوں کا سائز بدلتا رہتا ہے لیکن رسیدی ٹکٹ کا وہی چھوٹا سا رہتا ہے ٹھیک ہی کہا تھا جو کچھ بیتا وہ دل کی تہوں میں بیتا تھا اور وہ سب کچھ نظموں اور ناولوں کے حوالے ہو گیا، پھر باقی کیا رہا؟ پھر بھی کچھ سطور لکھ رہی ہوں کچھ یوں جیسے زندگی کے حساب کتاب کے کاغذ پر ایک چھوٹی سی رسیدی ٹکٹ چسپاں کر رہی ہوں، نظموں اور ناولوں کے حساب کتاب کی کی کچی رسید کو پکا کرنے کے لیے"(۱۹)

حواشی:

(۱)۔ پریتم، امریتا۔ ناگ منی (ناولٹ)۔ لاہور: روہتاس بکس، احمد چیمبر، ۵ ٹیمپل روڈ، ۱۹۹۲، ص، ۷

(۲)۔ ایضاً، ص، ۱۰

(۳)۔ ایضاً، ص، ۱۷

(٤)۔ رسیدی ٹکٹ، امرتا پریتم، علم و عرفان پبلیشرر، جون ۲۰۰۷، ص، ۲۰

(۵)۔ پریتم، امریتا۔ ایک تھی سارا۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴، ص، ۵

(٦)۔ ایضاً، ص، ۷، ٦،

(۷)۔ ایضاً، ص، ۷

(۸)۔ ایضاً، ص، ۱۷

(۹)۔ رسیدی ٹکٹ، امرتا پریتم، علم و عرفان پبلیشرر، جون ۲۰۰۷، ص، ۲۷

(۱۰)۔ امرتالوک، ناشر، پینگوئین بکس انڈیا، سن اشاعت، ۲۰۰٦، ص، ۱۲۹

(۱۱)۔ رسیدی ٹکٹ، امرتا پریتم، علم و عرفان پبلیشرر، جون ۲۰۰۷، ص، ۲۷

(۱۲)۔ ایضاً، ص، ۷۹

(۱۳)۔ ایضاً، ص، ۱۸

(۱٤)۔ ۱۱۹

(۱۵)۔ ایضاً، ص، ۱۱۰

(١٦)۔ایضا،ص،١٢٢

(١٧)۔ایضا،ص،٤٣،٤٢

(١٨)۔ایضا

باب پنجم

ادبی شخصیات کے فن کے بارے میں جب بھی گفتگو کی جاتی ہے یا ان کے فن کا ناقدانہ جائزہ لیا جاتا ہے اس ضمن میں ان کے معاصرین کا تذکرہ نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

امرتا پریتم پنجابی زبان کی معروف شاعرہ اور نثر نگار تھیں ان کے عہد میں اردو پنجابی اور ہندی ادب میں کئی ایسے بڑے نام موجود تھے جنہوں نے ادب کو نئے رجحانات سے روشناس کروایا تھا، امرتا کی تخلیقات تقسیم ہند، عورت کی داخلی کرب نامی اور واردات قلبی کی گہری چوٹ سے عبارت ہیں ان کے معاصرین نے بھی ان ہی موضوعات پر قلم۔ اٹھایا ہے مگر امرتا نے اپنے منفرد اسلوب اور نسوانی تجربے اور داخلی کیفیات کی شدت کے باعث ایک الگ شناخت قائم کرلی ہے۔

امرتا پریتم کے عہد کو ترقی پسند تحریک کا زمانہ کہا جائے تو بے جانہ ہو گا اس تحریک نے برصغیر کے ادیبوں کو سماجی ناہمواری، جبر استحصال اور خواتین کے مسائل جیسے موضوعات پر قلم اٹھانے کے لئے مجبور مجبور کیا۔

۱۹۴۷ کی تقسیم نے اس عہد کے تمام ادیبوں اور تخلیق کاروں کو متاثر کیا اور اس دور کے ادیبوں نے جی بھر کے ان موضوعات پر لکھا، ہجرت، قتل و غارتگری، لوٹ مار، عورتوں کی عصمت دری اور لاکھوں لوگوں کے بے گھر ہونے کے کرب کو ہر ادیب نے ایک لگ انداز سے محسوس کیا اس ضمن میں امرتا پریتم کی مشہور نظم آج اکھاں وارث شاہ نوں کو غیر معمولی پزیرائی ملی، تقسیم۔ پر لکھے گئے ان کے ناول۔ پنجر کو بھی ادبی حلقوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل رہی اور اس ناول پر ۲۰۰۶ میں بنائی گئی فلم کو بھی ایوارڈ سے نوازا گیا"۔(۱)

اس دور میں امرتا پریتم کے ساتھی ادیبوں میں راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی موہن سنگھ (پنجابی شاعر) سعادت حسن منٹو اور قرۃ العین حیدر کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

تقسیم ہند کے موضوع پر سعادت حسن منٹو کے افسانے بھی خاصے بیباک اور حقیقت پر مبنی ہیں انہوں نے بھی خواتین کو اپنے افسانے کا مرکزی کردار بنایا ہے، "کھول دو" ان کا مختصر افسانہ ہے جس میں ایک سفاک حقیقت کا بیان موثر انداز میں کیا گی ہے، خدیجہ مستور کا ناول " آنگن " تقسیم ہند کے موضوع پر ایک شاندار تخلیق ہے، قرۃ العین حیدر کا مشہور زمانہ ناول " آگ کا دریا" بھی تقسیم کے موضوع پر ہے مگر ان تمام ادیبوں کا اسلوب جُداگانہ اہمیت کا حامل ہے ذیل میں ان کا تقابلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

تقسیم ہند کے موضوع پر اپنے لکھے گئے ناول میں امرتا پریتم نے تانیثی ایجنڈے کو جدت اور رومانویت کے ساتھ پیش کیا ہے انہوں نے اپنے ناول میں ایک مظلوم عورت کی نمائندگی کی ہے، یہ ناول ایک ایسی عورت کی زندگی کا بیان ہے جس کو مذہبی دشمنی کے باعث اغوا کر لیا جاتا ہے اور وہ سکھ ہو کر بھی ایک مسلمان سے شادی کرنے اور ازدواجی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے شروعات میں وہ اپنے خاوند سے نفرت محسوس کرتی ہے لیکن بعد میں وہ مشرقی عورت شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد ایک ان چاہے مرد سے بھی محبت کرنے لگتی ہے یہاں امرتا نے مشرقی عورت کی نفسیات کو واضح کیا ہے اور ناول کے اختتام پر یہ دکھایا ہے کہ زندگی اس کو ایک بار یہ موقع دیتی ہے کہ وہ واپس اپنے خاندان کی طرف لوٹ جائے مگر وہ وفا کی دیوی اپنے شوہر اور بچوں کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی، یہ اس وفا کی نشانی ہے جو عورت کی سرشت میں شامل ہے۔

جب کہ اسی پس منظر میں لکھے جانے والا قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا ایک علامتی ناول ہے انہوں نے اپنے اس ناول میں دریا کو وقت کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے وقت نے اپنی رفتار بدلیں، بدلے ہوئے حالات اور ماحول سے تہذیبیں بنیں اور مٹ گئیں ان سب چیزوں کو قرۃ العین حیدر نے دریا کے بدلتے ہوئے روپ میں پیش کیا ہے، اس ناول میں انہوں نے شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے آگ کے دریا کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے اس کے علاوہ ان کے اسلوب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی آمیز اردو استعمال کرتی ہیں، در حقیقت وہ جس ماحول کی عکاسی کرتی ہیں اسی ماحول کی زبان استعمال کرتی ہیں ان کے ناول کی زبان موضوع کے مطابق علامتی اور انداز شاعرانہ ہے۔

ناول آگ کا دریا محض تقسیم ہند کی کہانی نہیں بلکہ کثیر الجہت ناول ہے تقسیم اس ناول کا ایک اہم موڑ ہے لیکن اصل موضوع تہذیب و تاریخ کا تسلسل اور انسان کی شناخت کی تلاش ہے۔

اسی طرح اگر نسائیت کے موضوع پر لکھے گئے امر تا پریتم کی کہانی " ایک شہر کی موت "کا موازنہ عصمت چغتائی کے افانے "لحاف " سے کیا جائے تو موضوع کے اعتبار سے دونوں ہی خواتین کی جنسی ضروریات اور عدم تشنگی کا مختلف پیرائے میں بیان ہیں عصمت نے اپنے افسانے میں ایک ایسی عورت کا کردار بیان کیا ہے جو شوہر کی بے التفاتی کے سبب ہم جنس پرستی کا شکار ہے جب کہ امر تا نے اپنی کہانی ایک شہر کی موت میں علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے سلطنت روم کے ایک بہت بڑے شہر کے کھنڈرات میں تبدیل ہو جانے کو عورت کی زندگی سے تشبیہ دی ہے وہ لکھتی ہیں کہ:

"پامپی کے کھنڈرات سے گھوم کر جب میں لوہے کے بیرونی دروازے کے قریب آئی تو اس لوہے کے دروازے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا، اس طرح تو کسی مرد نے بھی میرا ہاتھ نہیں پکڑا تھا، اور لوہے کا دروازہ پچھلی طرف ان کھنڈرات کی طرف چلنے لگا جہاں کئی ستون اور کئی دیواروں کے ٹکڑے کھڑے ہوئے تھے، کہیں بھی کوئی پردہ نہیں تھا، کبھی ہوتا ہوگا، کچھ چاروں طرف سے بند کمرے ہوتے ہوں گے اور پھر ان کے اندر بھی کچھ کوٹھریاں، مگر اب سب کچھ چوپٹ کھلا پڑا تھا سارے بھید زمین پر پڑے ہوئے تھے اور معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کون سا راستہ کہاں سے نکلتا تھا اور کہاں جاتا تھا ، راستوں کے گلے لگے ہوئے تھے۔ ایک لوہے کے ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا، میرا ہاتھ سن ہونے لگا، پہلے میرا دایاں ہاتھ سن ہوا، پھر دایاں بازو، دایاں کندھا اور پھر بایاں ہاتھ، بایاں بازو اور بایاں کندھا۔ میں لوہے کے دروازے سے دور ہونے لگی، زور لگایا مگر اب میرے پاؤں بھی سن ہونے لگے ، میں کس دروازے سے نکلی تھی اور کس راستے پر جانا تھا کچھ علم نہیں اب تو سارے گھر گرے ہوئے تھے اور سارے راستے رو رو کر ایک دوسرے کے گلے کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اور پھر معلوم نہیں کتنی دیر میری آنکھیں جلتی اور بجھتی رہیں اور پھر میری چھاتی میں کچھ ہنسنے لگ پڑا کہ اس پامپی کی طرح میں بھی کبھی ہوتی تھی۔ ایک دن میں اپنی ایک دوست عورت سے ملنے چلی گئی یہ میری ایک انگریز دوست کلیر عمر رسیدہ عورت ہے اس دن اس نے مجھ ایک چیز دکھائی ایک مردانہ انگ جو اس ہفتے وہ بازار سے خرید کر لائی تھی اس میں بیٹری لگی ہوئی تھی اور وہ بیٹری کی طاقت سے چلتا تھا، اس نے بتایا کہ وہ بیٹری کی طاقت سے چلتا ہے۔۔۔۔۔ اس کے الفاظ اس پر ترس کھا رہے تھے، کیا کروں اب اس عمر میں کوئی مرد نزدیک تک نہیں آتا۔

پہلے تو کبھی چار دنوں کے لئے کوئی مل جاتا تھا مگر جوں جوں عمر ڈھل رہی ہے۔۔۔۔۔۔ اور اور یہ سب دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اگر میں نے اپنی جوانی اپنی سانسوں کو دے دی تو آئندہ عمر مجھے بھی

ایک دن کلیر بازار جانا پڑے گا، بیٹری والا یہ ربڑ کا ٹکڑا میری قسمت بن جائے گا۔ اس دن کی طرح آج بھی پچھتاوا نہیں۔ صرف رات کو۔۔۔۔ جب جارج میرے ساتھ سویا ہوا تھا۔۔۔۔ دل میں آیا تھا کہ آج اس کو اپنے ساتھ اپنے مرے ہوئے شہر میں لے جاؤں۔ جس طرح لوگ پامپئی کے کھنڈرات کو دیکھنے جاتے ہیں، میں جارج کو ساتھ لے جاؤں اور اس کو اپنے شہر کے کھنڈرات دکھاؤں۔ پھر معلوم نہیں کیوں۔۔۔۔ جارج کو کچھ نہیں بتایا۔ صبح اٹھ کر وہ چائے کا پیالہ پی کر چلا گیا ہے اور میں اکیلی اپنے شہر کے کھنڈرات میں واپس آگئی ہوں..... یہ میری لاش..... اور وہ اونچی ہوتی دیواریں اس اٹاری کی ہیں، جس میں وریندر رہا کرتا تھا۔ یہ دیوار کے پاس اس کی لاش ہے، اس کے تمام نقش میری یاداشت میں سے ابھر آئے ہیں۔۔۔۔ چوڑے کندھوں پر تنا ہوا سر' چہرے کا رنگ گندی، مگر آنکھیں بہت سیاہ گہری اور تراشی ہو گئیں۔ وہ آنکھوں سے میری جان کو کھینچ لیا کرتا تھا..... اس کی اس اٹاری میں میں کئی دفعہ رات کو سپنوں میں گئی تھی..... اس کے قول واقرار سے بھری ہوئی میں اس کو اس کی گلی کے موڑ پر مل کر جب اپنے باپ کے کھلے صحن والے گھر آیا کرتی تھی۔۔۔۔۔ تو گھر کی دیواریں میرے جسم کو نچوڑ لیا کرتی تھیں۔ میرے باپ کے گھورنے سے۔۔۔۔۔ پیپل کے پتے جھڑ جاتے تھے اور میں دھوپ میں جھلس جاتی اور ایک دن۔۔۔۔ میرا کنوارہ جسم چھل گیا۔ گھر آئی کو ماں نے انگاروں جیسی آنکھوں سے دیکھا اور چولہے سے ایک لکڑی کھینچ کر کہا۔۔۔۔ "تم کو اس کی اتنی آگ لگی ہوئی ہے۔ تو یہ چنگاری اپنے اندر ڈال لو....." سپنوں سے اور سہیلیوں سے مردوں کی باتیں سنی ہوئی تھیں، مکوں جیسی باتیں مگر ماں کی بات سن کر یوں محسوس ہوا جیسے جلتی جلتی لکڑی میری ٹانگوں میں گڑ گئی ہو..... میں کتنے ہی دن بند اپنے کمرے میں روتی رہی..... اور ایک دن ماں کوئی سادھو پکڑ کرنے آئی، اور اس کا دیا ہوا تعویذ گھول کر مجھے زبردستی پلا دیا۔ ساری رات میں چھپ کرتے کرتی رہی مگر صبح سویرے جب وہ میری منگنی کا چھوہارا مجھے کھلانے گئی۔۔۔۔ معلوم ہوا کسی

رنڈوے کے ساتھ میری شادی کرنے لگی تھی۔ ویریندر ہمارے مذہب کا نہیں تھا اور یہ رنڈوا ہمارے مذہب کا تھا۔ میں نے چھوہارے کو منہ میں سے تھوک دیا۔۔۔۔ اور ماں کے ہاتھ سے بازو چھڑا کر ویریندر کے گھر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی اور اچانک زمین سے لاوا نکل پڑا۔۔۔۔ چاروں طرف سیاہ اور جلتی راکھ اڑنے لگی۔۔۔۔ سنا کہ گزشتہ ہفتے وریندر نے کسی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی.... اور اس جلتے شہر میں سے نکلنے کے لئے میں نے دایاں پاؤں آگے اٹھایا ہوا تھا اور بایاں پاؤں آگے رکھنے کے لئے ایڑی اٹھائی ہوئی تھی۔۔۔ کہ میں ویسے کی ویسے اس گرم راکھ میں ایک لاش بن گئی .... اور یہ میرے شہر کے کھنڈرات میں میری لاش"۔(۲)

امرتا پریتم نے اپنے اس ناول میں عورت کی ذات کے بہت سے ایسے پہلوؤں سے پردہ اٹھایا ہے جس کا ذکر کرنا ہمارے معاشرے میں آج بھی ممنوع سمجھا جاتا ہے، عورت کی جنسی زندگی اس کی خواہشات اور عدم تکمیل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر جب بھی بات کی جاتی ہے پدر سری معاشرے میں اس کو بے غیرتی اور فحاشی پر مبنی تحریر سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ ان سفاک حقیقتوں کا بذریعہ قلم اظہار ہے جو عملی شکل میں ہمارے معاشرے میں جا بجا نظر آتی ہی مگر ان حقیقتوں پر پردہ ڈال کر ان سے صرف نظر کر کے زندگی گزارنے پر زور دیا جاتا ہے کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی سماجی قدروں کے نام پر ان حقیقتوں سے پہلو تہی کی جاتی ہے جس کا اظہار امرتا نے کنایتاً کیا ہے۔

عصمت چغتائی کے ناول لحاف میں بھی سماج کی ایسی ہی یک تلخ حقیقت کا بیان ملتا ہے مگر آسان اور کھلے لفظوں میں۔ عصمت نے جب یہ ناول لکھا تو ان پر بھی تنقید کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ عصمت چغتائی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری کاغذی ہے پیرہن میں لکھا: 'لحاف' نے مجھے بڑے جوتے کھلوائے۔ اس کہانی پر میری اور میرے شوہر (شاہد (لطیف) کی اتنی لڑائیاں ہوئیں کہ زندگی جنگ کا میدان بن گئی۔ مگر مجھے لحاف کی بہت بڑی قیمت ملی ساری کوفت

مٹ گئی۔ بہت دن بعد علی گڑھ گئی وہ بیگم جن پر میں نے کہانی لکھی تھی، ان کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ لوگوں نے انھیں بتادیا تھا کہ لحاف ان پر لکھی گئی ہے۔

ایک دعوت میں ان سے سامنا ہو گیا۔ میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ انھوں نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھول کی طرح کھل اٹھیں۔ بھیڑ چیرتی ہوئی لپکیں اور مجھے گلے لگالیا۔ مجھے ایک طرف لے گئیں اور بولیں۔ پتہ ہے، میں نے طلاق لے کر دوسری شادی کرلی ہے۔ ماشااللہ میرا چاند سا بیٹا ہے۔ میرا جی چاہا کسی سے لپٹ کر زور زور سے روؤں۔ آنسو روکے نہ رُکے مگر میں قہقہے لگا رہی تھی۔ انھوں نے میری بڑی شاندار دعوت کی میں مالامال ہوگئی۔ ان کا پھول سا بچہ دیکھ کر مجھے ایسا لگا وہ میرا بھی کوئی ہے۔ میرے دماغ کا ٹکڑا۔ میرے ذہن کی جیتی جاگتی اولاد میرے قلم کا بچہ اور میں نے جان لیا کہ چٹان میں بھی پھول کھل سکتے ہیں۔ خون جگر سے سینچنے کی شرط ہے"(۳)۔

جب کہ امریتاپریتم اپنے ناول یک شہر کی موت کے بارے میں کہتی ہیں:

> "۵ ستمبر ۱۹۷۳ کی رات تھی شب کے ساڑھے دس بجے تھے میں کازان راکس کی کتاب دراک گارڈن پڑھ رہی تھی کہ ٹیلی فون آیا ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر کہہ رہے تھے صبح سینٹ کی میٹنگ ہے جس میں تمھاری کتاب ایک شہر کی موت کے خلاف resolution پاس ہونا ہے، میں تمھارے والد کا دوست ہوا کرتا تھا ان کی عزت کرتا تھا اس لئے تم کو فون کر رہا ہوں کہ تمھاری کہانی ایک شہر کی موت کے ساتھ تمھاری تحریر کی بھی موت ہوگئی میں نے یہ موت کی خبر وائس چانسلر سچ مچ اس موت پر افسوس کر رہے تھے اسلئے ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کر کے پوچھا آپ نے یہ کہانی پڑھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں مجھے لٹریچر کے بارے میں زیادہ علم نہیں میں تو سائنس کے

آدمی ہوں آپ کو لٹریچر کے بارے میں زیادہ علم نہیں تو بھی آپ کی فراست پر اعتماد کر کے کہنا چاہتی ہوں کہ آپ ایک بار اس کہانی کو پڑھیں۔ میرے پاس اس کے synopsis آئے ہیں وہ برے ہیں۔ Synopsis ہو سکتا ہے صحیح نہ ہوں Synopsis کیسے غلط ہو سکتے ہیں؟ کوئی prejudiced mind لکھے تو وہ غلط ہو سکتے ہیں اصل میں میں تمھارے والد کا احترام کرتا تھا وہ بڑے بلند خیال انسان تھے تمھاری عزت بھی کرنا چاہتا ہوں تم ایسا لکھو کہ ہم تمھاری عزت کر سکیں فکر نہ کیجئے جب تک میری نگاہوں میں میری عزت ہے میرے ناموس پر حرف نہیں آسکتا میری طرح میری عزت نے بھی ساری عمر کسی پر انحصار نہیں رکھا، فون بند ہو گیا، تو وہ بھی میری طرح ہنس رہی تھی"۔(٤)

مندرجہ بالا سطور میں عصمت چغتائی اور امرتا پریتم دونوں کی بے باک تحریر کے حوالے سے آنے والے عوامی رد عمل اور اس کے جواب میں مصنفین کے اختیار کردہ طرز عمل سے دونوں کی شخصیت واضح ہو جاتی ہے عصمت کو معاشرے ک خوف دامن گیر تھا شوہر کی طرف سے مخالفت کا سامنا تھا اور ان کے دل کے اندر کونے میں کہیں یہ خوف دامن گیر تھا کہ یہ سب لکھ کر معاشرے کی تلخ سچائی کا بیان کر کے شاید انہوں نے کوئی غلط کام کر دیا ہے مگر امرتا کہ ہاں ایسا کوئی خوف نظر نہیں آتا وہ پوری جرآت اور بے باکی کے ساتھ معاشرے کی حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے خود کو حق بجانب سمجھتی ہیں امرتا کا یہ ہی نڈر پن انہیں عصمت چغتائی یا دوسری خواتین ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔

حواشی:

(۱)۔امرتا پریتم کی شاعری،تراجم،فہمیدہ ریاض،نگارشات پبلیشرز،سن اشاعت،۲۰۱۹،

(۲)۔ناول ایک شہر کی موت صفحہ نمبر ۱۲۸،۱۱ء۱۰ء۸

(۳)۔کاغذی ہے پیرہن،خود نوشت،عصمت چغتائی،ناشر،روہتاس بکس احمد چیمبر،۵،ٹیمپل روڈ لاہور،۱۹۹۲

(٤)۔رسیدی ٹکٹ،امرتا پریتم،علم و عرفان پبلیشرز،جون ۲۰۰۷،ص،۱٤۳،۱٤۲

باب ششم

ماحصل

زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں امرتا پریتم کی شخصیت اور ان کی تخلیقی کاوشوں کا مطالعہ نسائی شعور کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ اس تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امرتا پریتم کی ذاتی زندگی، ذاتی تجربات اور سماجی جبر نے ان کے فکری رویّے اور ادبی اظہار کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ انہوں نے پدرسری نظام کی بے جا پابندیوں کو نہ صرف اپنی عملی زندگی میں مسترد کیا بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے بھی عورت کی آزادی، خود مختاری اور شناخت کے حق میں ایک مضبوط اور مزاحمتی آواز بلند کی۔ تحقیقی تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امرتا پریتم کے افسانوں، ناولوں اور نظموں میں پیش کی گئی عورت محض مظلوم یا خاموش کردار نہیں بلکہ ایک باشعور، حساس اور سوال اٹھانے والی ہستی کے طور پر سامنے آتی ہے، جو سماجی ناانصافیوں، صنفی امتیاز اور مردانہ بالادستی کے خلاف مزاحمت کی علامت بن جاتی ہے۔ ان کی تحریروں میں عورت کے جذباتی اور نفسیاتی مسائل کو نہایت فنی، علامتی اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، جو قاری کو عورت کے باطن میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

یہ تحقیق اس امر کو بھی ثابت کرتی ہے کہ امرتا پریتم کا نسائی شعور برصغیر کے سماجی، ثقافتی اور تاریخی تناظر میں ایک فکری بغاوت کی حیثیت رکھتا ہے، جو روایتی نسوانی کردار کے محدود تصور سے آگے بڑھ کر عورت کو ایک مکمل انسان کے طور پر پیش کرتا ہے۔ مجموعی طور پر اس مقالہ میں امرتا پریتم کی ان تحریروں کو اجاگر کرنے کی

کوشش کی گئی ہے جو نہ صرف نسائی مسائل کی عکاس ہیں بلکہ موجودہ دور کی خواتین میں خود آگاہی، خود اعتمادی اور فکری بیداری پیدا کرنے میں بھی معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

امرتا پریتم کی یہ تصانیف عصر حاضر کی خواتین کی شعوری بیداری میں بھی اہم۔ کردار ادا کرتی ہیں اگرچہ قاری کے پاس وہ فہم و فراست ہو جس کی مدد سے ان کی تحریروں سے وہی اسباق لیے جا سکیں جو وہ طبقہ نسواں کو حقیقتاً دینا چاہتی تھیں، یہ مزاحمتی انداز اور سماجی بیڑیوں سے بیزاری در اصل نسوانی انا پر پڑنے والی معاشرتی چوٹ ہے جس نے اسے اپنے حق کے لئے لڑنا اور اپنے وقار کے لئے ڈٹ جانا سکھایا ہے، پدر سری سماج میں مضبوط اور خود مختار عورت کے حوالے سے جو منفی رویے دیکھنے میں آتے ہیں امرتا پریتم نے اپنی تحریروں میں ان کا موثر طریقے سے جواب دینے کی کوشش کی ہے جس سے موجودہ دور کی خواتین کو بھی یہ سیکھنے میں مدد ملتی ہے کہ عورت اگر سماجی بندشوں اور قدیم اصولوں کی پروانہ کرتے ہوئے صرف اپنی ذات کو فوقیت دے اپنی زندگی کے فیصلے اپنی مرضی سے کرنا چاہے تو وہ باغی نہیں ذی شعور ہے، بے باک نہیں دلیر ہے اور صرف ایک مضبوط عورت ہی آئندہ آنے والی نسلوں کی مضبوطی اور خوشحالی کی ضامن ہے۔

اگرچہ امرتا پریتم بنیادی طور پر پنجابی زبان کی شاعرہ اور ادیبہ ہیں، تاہم ان کے ناولوں، افسانوں اور نظموں کے اردو تراجم بھی دستیاب ہیں، جو اردو قارئین کے لیے ان کی فکری اور ادبی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔ اردو زبان و ادب کا یہ امتیازی وصف ہے کہ وہ دیگر زبانوں کے ادب کو اپنے اندر جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے، اسی بنا پر تراجم کے ذریعے دوسری زبانوں میں تخلیق ہونے والا ادب بھی اردو قارئین تک پہنچتا ہے اور یوں فکری تبادلے اور ادبی وسعت کے نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں اس کی بہترین مثال پنجابی زبان کے

انقلابی شاعر بابا بلھے شاہ، سندھی زبان کے صوفی شاعر شاہ عبد الطیف بھٹائی اور کبیر داس (پنچ میل / ملی جلی زبان یعنی ہندی، برج بھاشا، اودھی، پنجابی اور فارسی) ہیں جن کی تخلیقات کے اردو تراجم نے اردو ادب کے قارئین کو مختلف تہذیبوں، روحانی بصیرت اور انسانی تجربات سے روشناس کروایا ہے۔ یہ حقیقت اس امر کی دلیل ہے کہ ادب اور فن کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اور اہل دانش و بینش کسی بھی زبان کے علم سے مستفید ہونے کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتے ہیں۔

کتابیات:

امرتا پریتم کی شاعری، تراجم، فہمیدہ ریاض، نگارشات پبلیشر ر، سن اشاعت، ۲۰۱۹،

امرتا لوک، ناشر، پینگوئین بکس انڈیا، سن اشاعت، ۲۰۰۶،

کلیاتِ ساحر، ساحر لدھیانوی، سن اشاعت، ۱۹۹۸، حسامی بک ڈیپوٹ، حیدر آباد،

رسیدی ٹکٹ، امرتا پریتم، علم و عرفان پبلیشر ر، جون ۲۰۰۷،

پریتم، امریتا۔ ناگ منی (ناولٹ)۔ لاہور: روہتاس بکس، احمد چیمبر، ۵ ٹیمپل روڈ، ۱۹۹۲۔

پریتم، امریتا۔ ایک تھی سارا۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴۔

پریتم، امریتا۔ ایک تھی انیتا۔ دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، ۲۰۱۲۔

Britannica Concise Encyelopedia http://wwwbritannica.com

feminism Retrieved on ۰۷/۰۷/۲۰۲۵

http://www.merrium.webster.com/dictonary/feminismRetrieved on ۰۸/۰۷/۲۰۲۵

۱۰/۰۷/۲۰۲۵

Collins Dictionary and Thesaurus, (۲۰۰۶), Collins, London'Feminism is the belief in the importance of gender equality.

invalidating the idea of gender hierarchy as a socially constructed concept." By Nancy Cott (۱۹۸۷), The Grounding of Modern Feminism, Yale University Press.

Cornell Durcilla (۱۹۹۸), At the Heart of Freedom; Feminism, Sex and Equality. Princeton University Press, Princeton, NJ

Walby, S. (۲۰۰۰), Feminist Theory, Rouledge, London

Weedon, C (۱۹۹۹), Feminism, Theory and the Politics of Difference. Blackwell, Oxford

)Nancy Cott (۱۹۸۷), The Grounding of Modern Feminism, Yale University pre

(۱۰) Nancy Cott (۱۹۸۷), The Grounding of Modern Feminism, Yale University

عورتوں کی محکومیت(۱۹۹۳)ترجمہ افتخار شیروانی مطبوعہ فیروز سنز-لاہور

Nancy Cott (۱۹۸۷) The Grounding of Modern Feminism Yale University Press

Davidoff (۱۹۸۶), Our Work, Our Lives, Our Words: Women's History, Women's Work, MacMillan, London

Simone de Beauvoir, ۱۹۷۴ (۱۹۵۲), The Second Sex, Translated and edited by Parshley. Vintage Books, New York

Elanie Showalter, (۱۹۸۸) Towards a Feminist Poetics: The New Feminist Criticism Random House, New York

Betty Friedan, (۱۹۶۳) The Feminine Mystique, Norton, New York

] Elanie Showalter (۱۹۸۸), The New Feminist Criticism, Random House, New York

سر سید احمد خان (۱۸۵۷ء) ۱۹۸۶ء، اسباب بغاوت ہند (فصل اول)، اردو اکیڈمی سندھ۔

محمد امین زبیری (۱۹۵۶ء) مسلم خواتین کی تعلیم۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی

محمد امین زبیری (۱۹۵۶ء) مسلم خواتین کی تعلیم، ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی

ڈاکٹر یمیں شمر فضل (۱۹۹۱) ہندوستانی مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی، دہلی

نصیر احمد ہاشمی (۱۹۵۶ء) ۱۹۸۵ء۔ دکن میں اردو، ترقی اردو بیورو، دہلی

ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل (۱۹۹۱ء)، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ، دہلی میں،

مولانا امداد صابری (۱۹۷۴ء)، تاریخ صحافت اردو (جلد ۵) دیلی

رازق الخیری (۱۹۶۴ء) ماہنامہ عصمت کراچی (سالگرہ نمبر) جولائی اگست،

ڈاکٹر عصمت جمیل (۲۰۰۱ء)، اردو افسانہ اور عورت، شعبہ اردو زکریا یونیورسٹی، ملتان،

The Emergence of Feminism Among Indian Muslim Women

(۱۹۲۰), Azra Asghar, London

وقار عظیم (۱۹۶۸ء) صحیفہ لاہور۔ اپریل ۴۸ء

قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے (حصہ اول)، لاہور

رازق الخیری (۱۹۶۷ء) ماہنامہ عصمت، کراچی بابت دسمبر ۶۷ء

ڈاکٹر نیام فرزانہ (۱۹۹۲ء) اردو کی اہم ناول نگار خواتین علیگڑھ

نصیر الدین ہاشمی (۱۹۵۲ء) دکن میں اردو، لاہور،

ڈاکٹر فرمان فتحپوری (۱۹۸۲ء)، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین (۱۹۹۱) ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ مشمولہ خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ،

ڈاکٹر عظمی فرمان فاروقی، "اردو ادب میں نسائی تنقید" (روایت مسائل و مباحث) ناشر، سعید پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۰